سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیاتِ اُردو شمارہ (۱۴۲)

آبگینۂ شعر

بشیر النساء بیگم بشیر
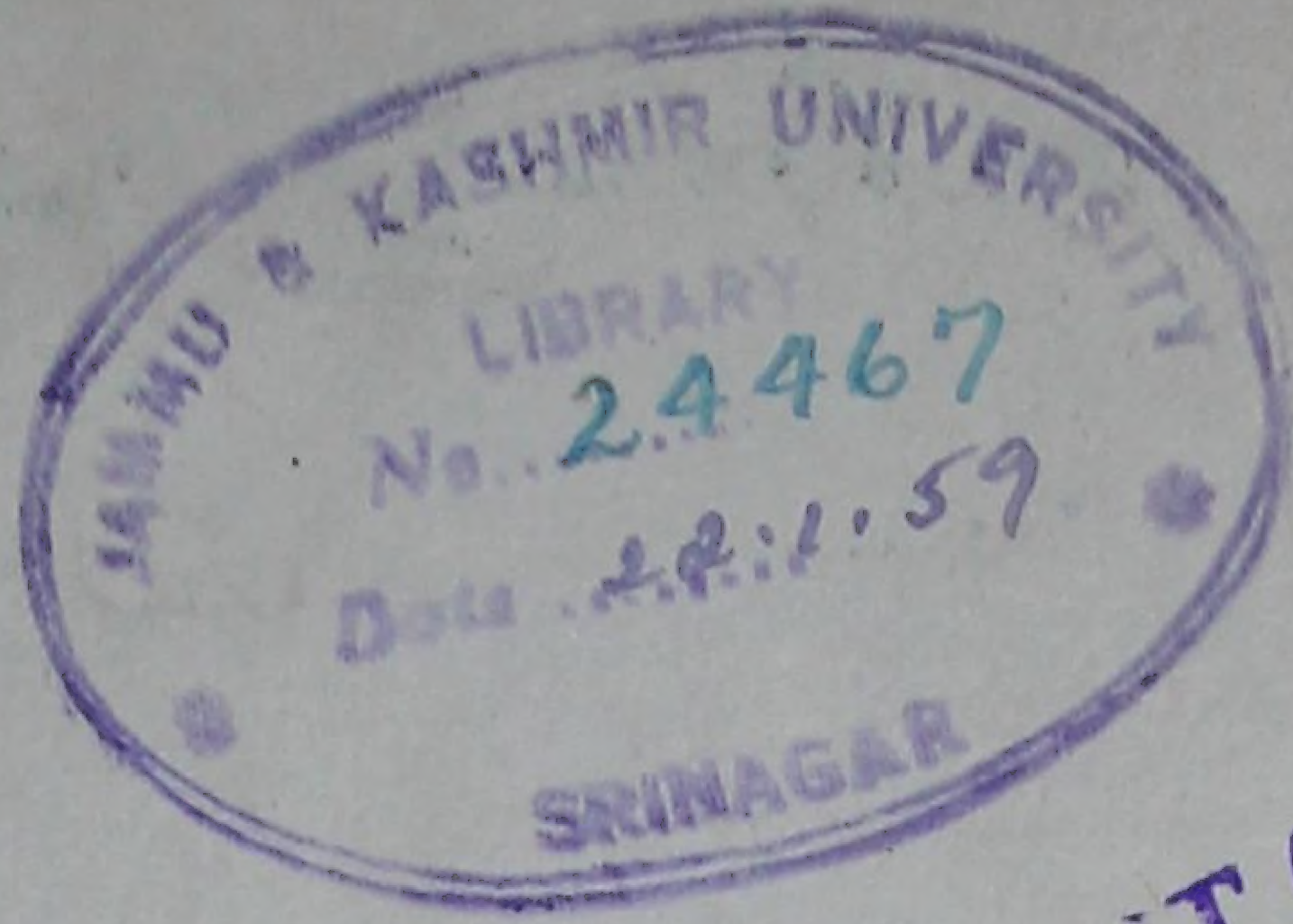
سنہ ۱۹۴۸ء

ملنے کا پتہ

سب رس کتاب گھر۔ خیرت آباد

حیدرآباد دکن

قیمت (چھے روپے)

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس۔ حیدرآباد دکن

فہرست

اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ امر موجب مسرت ہوگا کہ دکن کی مشہور شاعرہ محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر کے کلام کا پہلا مجموعہ "آبگینۂ شعر" ادارے کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔

ادارے کے شعبۂ نسواں کی خواہش اور مسلسل تقاضوں کے بعد محترمہ نے اس مجموعے کے انتخاب اور ترتیب کا کام ۱۹۴۴ء ہی میں مکمل فرما دیا تھا اور اس کی کتابت و طباعت کے بارے میں کئی بار "سب رس" میں اطلاعیں شائع ہو چکی تھیں لیکن بعض ناگزیر وجوہ کی بناء پر اس کی اشاعت میں تعویق ہو گئی جس کے لئے ادارہ معذرت خواہ ہے۔

محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ عہدِ حاضر کی وہ صاحبِ کمال خاتون ہیں جن کا کلام اردو دنیا میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس "آبگینۂ شعر" کی اشاعت سے توقع ہے کہ جدید اردو شاعری میں ایک شائستہ اور حلاوت آمیز کلام کا اضافہ ہو گا۔

ادارۂ ادبیات اردو محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ کے ساتھ اُن کے علم دوست رفیقِ زندگی مولوی مرزا ضامن علی صاحب غازی کا بھی شکر گزار ہے جن کی خاص توجہ اور دلچسپی کی وجہ سے اس مجموعے کے مرتب ہونے اور منظرِ عام پر آنے میں بڑی سہولت ہوئی ورنہ ادارہ اور اردو دنیا کو شاید ابھی کچھ اور انتظار کرنا پڑتا۔

ادارہ

آبگینۂ شعر

مرا ضمیر ہے بیتابِ جستجو، اس میں
جھلک رہی ہے مرے دل کی آرزو اس میں!
بشیرؔ کیا کہوں، کیا شئے ہے آبگینۂ شعر،
مری سرشت ہے خود میرے روبرو اس میں!

بشیرؔ

۷ر مارچ ۴۴ء

حضورِ یزداں میں

حضورِ یزداں میں

یا رب ترے کرم سے عطا زندگی ہوئی!
پیدا ربوبیت سے مری بندگی ہوئی!

تھمتے نہیں وجود و عدم کے تغیّرات
لیکن مری خودی میں یہ کیوں خودسری ہوئی؟

رنگینیوں میں گُم ہیں اگرچہ تاثرات
فطرت مگر ہے عزم پہ اپنے جمی ہوئی

میرے تصوّرات کی موجوں میں تو رواں
اور میرے واردات سے دنیا بھری ہوئی

میری نوا میں تیرے مقاصد کا ہے ظہور
میری نظر ہے حسن میں تیرے بسی ہوئی

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی جلوہ نمائیاں
جن سے ترے کلیم کو خود آگہی ہوئی!

میری حیات تیرے تجسّس میں مضطرب!
لیکن مری تلاش تجھے بھی کبھی ہوئی ـــ؟

(۲)

راز بقا کی شرح کو عالم پہ عام کر
دُنیا سمجھ رہی ہے کہ فانی حیات ہے!

میرے جگر کے خون سے رنگیں ہے داستاں
میرے ہی دم سے کارگہِ ممکنات ہے!

مجھ کو جو آبِ خضر ملے بھی تو پھینک دوں
نا آشنائے مرگ بھی کوئی حیات ہے؟

آتش نوائیوں سے دو عالم چمک اُٹھے
ہر انقلاب قلب کی اک واردات ہے!

میری حیاتِ چند نفس، نقشِ ناتمام
سرمایۂ حیات فقط تیری ذات ہے!

میرا شعور وجہِ تسلّی نہ بن سکا
ہر جنبشِ نگاہ پئے التفات ہے!

بیتاب میری لئے ہے تری بزمِ کائنات!
اے کارساز! تو ہی مری کائنات ہے!

(۳)

کیفِ حیات میری نگاہوں میں رچ گیا
لے کر میں کیا کروں یہ ترا جام، یہ سبو!

ہنگامہ زار ہیں دلِ آدم کی وسعتیں
تصویرِ اضطراب ہے یہ موجِ آب جو

گرد و غبارِ راہ کے نقش و نگار ہیں
دشت و جبل ہجومِ تفکّر کے روبرو!

میرے دلِ شکستہ کو یوں منتشر نہ کر
بیتاب ہو نہ جائے کہیں تیری آرزو!

طے ہو رہی ہیں جادۂ منزل کی منزلیں
ایک ایک مرحلہ ہے، ہر اندازِ رنگ و بو

سوزِ یقیں سے قلب و نظر آتشیں رہیں
مانوسِ اضطراب رہے ذوقِ جستجو.

حسنِ قبول میری نواؤں کو بخش دے!

ضائع نہ جائے محرمِ اسرار کا لہو!

(۴)

دل بھی بدل رہے ہیں زمانے کے ساتھ ساتھ — فرسودہ ہو رہے ہیں پرانے تاثرات!

فرزانگی نے دام بچھائے نئے نئے — دیر و حرم سے بھاگ رہے ہیں تصوّرات

مانا کہ تیرے چاند ستاروں پہ بس نہیں — حسنِ نظر کی پھر بھی ہے محتاج کائنات!

مضمر حریمِ قلب میں ہے روحِ اضطراب — پیدا ہے ہر نفس سے نشانِ رہِ حیات

عالم ہے جلوہ زارِ حدودِ نگاہ میں — اور دل ہے ایک عالمِ احساس و التفات

ہے قلبِ ناصبور حوادث سے چور چور — سرگرمِ آرزو ہے مگر ذوقِ واردات!

فکر و خیال و وہم و گماں میں ہے کشمکش!

اور ان تصوّرات سے بیگانہ تیری ذات!

(۵)

تعمیرِ نو کا ذوق ہے نقشِ کہن کی موت
صورت گرِ وجود، عدم کا نظام ہے!

پیہم تغیرات میں پلتی ہے زندگی
اضدادِ رنگ و بو ہی کو حاصل دوام ہے

میرا نشان عقل و خرد کو نہ مل سکا
کتنا بلند منزلِ دل کا مقام ہے!

ذوقِ نظر کے ساتھ جو قلبِ غنی دیا
یہ تیری دین ہے، یہی عیشِ دوام ہے!

دل کا سکون فرطِ کشاکش میں کھو گیا
شاید قریب منزلِ سوزِ تمام ہے

دل ڈوبتا ہے لحظہ بہ لحظہ برنگِ نو
ہر "دم" جنونِ شوق کا تازہ پیام ہے!

میرا وجود میرے عدم کا ثبوت ہے!
بود و نبود، میری حقیقت کا نام ہے!

(٦)

دل ذوق و شوقِ حسنِ ازل کا ہے آئینہ
مخفی تاثرات ہیں اسرار کے امیں!

اک جنبشِ نگاہ میں جلوے ہزار ہیں
سرمایۂ حیات ہے، آہنگِ دل نشیں

انا تجلّیوں سے ہیں معمور دو جہاں
کیوں محوِ اضطراب ہے میرا دلِ حزیں

ہے میرے دل کو شدّتِ احساس سے گلہ
میری نگاہ معترضِ خیر و شر نہیں

میری بساط کیا جو حوادث پہ ہو عبور
تو دل نشیں ہے، اور ترے بس میں کیا نہیں؟

گم ہے روایتوں میں مذاہب کی آب و تاب
افکارِ نو میں غرق ہوا عالمِ یقیں!

پابندیٔ نظامِ جہاں کی یہ بے حسی!
اندیشہ ہے کہ توڑ نہ دے میرا دل کہیں!

(۷)

اک گردشِ مدام و مسلسل ہے زندگی
پھر بھی قرار کے لئے دل بے قرار ہے!

عزم نمود و ولولۂ ذوقِ برتری
تخلیقِ کائنات سے خود آشکار ہے!

وابستۂ حیات ہے ہنگامۂ وجود
ہر ذرہ زندگی کے لئے بے قرار ہے!

ہے پیش کش یہ میرے شعورِ وجود کا (ق)
نقشِ حیات جس میں مرا آشکار ہے!

یعنی یہ آبگینۂ احساسِ زندگی
جو میرے واردات کا آئینہ دار ہے!

نغم جس کے رُوپ میں مرے لیل و نہار ہیں
اور جذب جس میں میرا ادبی انتشار ہے!

یا رب عطا ہو زندگیٔ جاوداں اسے!
تیرے جہاں میں میری یہی یادگار ہے!!

نذرِ رسالتؐ

نورِ ظہور

آباد گرچہ تھا جہاں، لیکن عجیب رنگ تھا
ہنگامۂ زمین پر، خود آسمان دنگ تھا

ظلم و ستم تھے حکمراں، ہر سمت تھیں تباہیاں
تاریک وادیوں میں تھا، سیلابِ زندگی رواں

روپوش حق پرستیاں، خودداریاں اسیر تھیں
بیباک خود فریبیاں، بیگانۂ ضمیر تھیں

بستے تھے گو یہاں بشر، لیکن "بہ شر" تھے سربسر
جن کی نظر سے تھا نہاں، فرق و تمیزِ خیر و شر

جبر و فساد کا ہنر پہنچا ہے جب کمال پر
قدرت کو رحم آگیا، اہلِ زمیں کے حال پہ

چمکے نصیب دہر کے، شام و سحر بدل گئے!
بکھرے ہوئے سنور گئے، گرتے ہوئے سنبھل گئے

آئی صدائے جبرئیل، رمزِ ازل ہے آشکار!
عالم میں جلوہ گر ہوا، نوعِ بشر کا شاہکار!

کون و مکاں چمک اٹھے وحدانیت کے نور سے
چھانے لگیں تجلیاں، رہ رہ کے سمتِ طور سے

انسانیت کا آفتاب ابھرا عرب کی خاک سے
وہم و گماں لرز گئے، روحانیت کی دھاک سے

گردِ غبارِ جہل سے، افکار پاک ہو گئے
انوارِ ذوق و شوق سے دل تابناک ہو گئے

فکر و نظر پہ چھا گئی تابندگی نگاہ کی
معبود و عبد میں ہوئی بنیاد رسم و راہ کی

قلب و نگاہ دُھل گئے، کردار نیک بن گئے
ہر رنگ و ہر طریق کے انسان ایک بن گئے

اسرار دل پہ کُھل گئے، کیفیتِ حیات کے
نغمے جہاں میں گونج اُٹھے، سرودِ کائنات کے

سررشتۂ ربوبیت روئے زمیں پہ آ گیا!
نورِ ظہورِ مصطفےٰ[۲] کون و مکاں پہ چھا گیا!

۱۹۴۶ء

رحمۃ للعالمین ﷺ

درِ رحمت کھلا ماہِ ربیع الاوّلیں آیا
جہاں میں غل ہوا محبوبِ رب العالمیں ﷺ آیا

یہ رحمت ہے خدا کی رحمۃ للعالمیں ﷺ آیا
خدا کا رازداں، اور رمزِ قدرت کا امیں آیا

زمیں پر آسماں بھی آج کے دن رشک کرتا ہے
یہ وہ دن ہے جہاں میں بانیِٔ دینِ متیں آیا

ہویدا جب ہوا، نورِ رسالتؐ خاکِ بطحیٰ سے
تنِ اسلام میں گویا دمِ جاں آفریں آیا

جہاں میں قلبِ زنگ آلودِ انساں پاک کرنے کو
رسولِؐ پاک سیرت، پاک باطن، پاک بیں آیا

فضائے دہر تھی تاریک بدعت سے جہالت سے
جہاں میں نورِ ایماں لے کے شمس العارفیں آیا

دکھا کر راستہ سیدھا ملانے حق سے بندوں کو
ہمارا رہنما اور ہادیِ دینِ متیں آیا

قدومِ پاک سے تیرے ہوئی ہے عرش کو زینت
بجز تیرے نبی کوئی وہاں جا کر نہیں آیا

تری بعثت سے ہم نے مژدۂ لاتقنطو پایا
ترے باعث ہمارے ہاتھ قرآنِ مبیں آیا

١٩٣٢ء

عیدِ میلاد

ہوگئی اب تکمیلِ دیں سردارِ دیں پیدا ہوئے
ہو مبارک! آج ختم المرسلیں پیدا ہوئے

ذرّے ذرّے سے ہے پیدا آج شانِ تمکنت
یعنی اسرارِ الٰہی کے امیں پیدا ہوئے

آفتابِ نور چمکا، مطلعِ اسلام سے
مژدہ اے دل قلبِ مسلم کے مکیں پیدا ہوئے

آج اس کی آفرینش کی خوشی کا جشن ہے
جس کی پیدائش سے انوارِ یقیں پیدا ہوئے

حاملِ مُہرِ نبوت، تاجدارِ انبیاءؑ
ربِّ ایزد کے رسولِ آخریں پیدا ہوئے

عید ہر دیندار کی ہے، عیدِ میلادِ نبیؐ
دینِ کامل لے کے، ختم المرسلیں پیدا ہوئے

شاہِ بحر و بر کی بے پایاں عقیدت سے بشیرؔ
کیسے کیسے دل میں طوفانِ یقیں پیدا ہوئے

۱۹۴۴ء

شانِ مُصطفوی

اے بانیٔ اسلام، دلِ قبلہ نما دے
ان ٹوٹے ہوئے نالوں کو پھر آہِ رسا دے

جو خوگرِ لا ہیں انہیں اِلّا کا پتا دے
بھولے ہوئے اسباقِ کہن یاد دلا دے

پھر مصطفوی شان زمانے کو دکھا دے

کیا دیکھ رہا ہے ابھی، اسلام کے والی
دنیا ترے پیغام سے ہونے کو ہے خالی

میخانہ لٹا، رہ گیا اک جام سفالی
ڈھائی ہوئی تعمیر نئے سر سے بنا دے

پھر مصطفوی شان زمانے کو دکھا دے

تاویل کے پھندوں میں ہے جکڑا ہوا قرآں
تہذیب کے الجھاؤ میں، الجھا ہے مسلماں

سینوں سے لرزتا ہوا، رخصت ہوا ایماں
اے ہادیٔ برحق ہمیں پھر اپنا بنا دے

پھر مصطفوی شان زمانے کو دکھا دے

مرعوب ہوئے جاتے ہیں اعدا کے اثر سے
تنویر گئی قوم کی اربابِ نظر سے

دے ہوش انھیں یا ابدی نیند سلادے
نیرات بھی پانے لگے اشرار کے در سے

پھر مصطفوی شان زمانے کو دکھادے

آوارہ و سرگرداں ہے اب قوم بچاری
کٹ پتلی بنے دین و مذاہب کے پجاری

جی اٹھے یہ ایسی کوئی اکسیر پلا دے
امت پہ تری حالتِ سکرات ہے طاری

پھر مصطفوی شان زمانے کو دکھادے

یا بھیج دے پھر خالدؓ و ٹیپوؒ کو مکرر
پیدا ہو یہاں پھر کوئی فاروقؓ کہ حیدرؓ

جانبازئ شبیرؑ، تن آساں کو سکھادے
طارق کا جگر، جرأتِ ایوبیؒ عطا کر

پھر مصطفوی شان زمانے کو دکھادے

پھر نعرۂ تکبیر کی تفسیر بنادے
پھر جذبۂ ایمان پرستی کو جگادے

پھر اپنے مسلماں کو مسلمان بنادے
پھر قلبِ غنی ما حصلِ بیم و رجا دے

پھر مصطفوی شان زمانے کو دکھادے

۱۹۳۹ء

بحضورِ سرورِ کائنات ﷺ

خوشا وہ دور کہ محبوبِ کبریا آیا
خدا کے بندوں کی کشتی کا ناخدا آیا

جہاں میں عیدِ ولادت منائی جاتی ہے
فلک پہ دولتِ رحمت لٹائی جاتی ہے

وہ سر زمینِ عرب آسماں سے کیا کم ہے
کہ اس کو فخرِ ورودِ رسولِ اکرم ہے

ہزار بار درود اور سلام ہو اُس پر
سلام بھیجا ہے پروردگار نے جس پر

سلام اُس پہ جو انسانیت کا ہے بانی
سلام اس پہ جو ہے بے نظیر و لاثانی

زہے نصیب! یہ معراجِ کامیابی ہے!
کہ بارگاہِ رسالت میں باریابی ہے!

حضور! دہر کی حالت بیان کیا کیجے
ہے عرضِ حال سے قاصر زبان کیا کیجے

تقاضا دل کا ہے رنگِ ملال عرض کروں
شکستہ حال مسلماں کا حال عرض کروں

وہی زمانہ، وہی آسماں، وہی ہے زمیں
وہی مراسمِ دیرینہ ربطِ خاک و جبیں

صفِ نخیل سے اب بھی اُبھر رہا ہے قمر
ہے تپتی ریگ و بیاباں میں اونٹ محوِ سفر

ہے قبلہ گاہ ابھی تک سیاہ پوشِ حرم
تبرکات میں داخل ہے ہدیۂ زمزم

وہی اذانوں سے معمور شام آتی ہے
ہر اک سحر وہی پیغامِ خیر لاتی ہے

اگرچہ اب بھی خدا کا کلام باقی ہے
اگرچہ رسمِ درود و سلام باقی ہے

اگرچہ عام ہے اب تک زکوٰۃ و روزہ نماز
اگرچہ تازہ ہے ہر سال شوقِ سیرِ حجاز

مگر! نظر میں یقیں، قلب میں حضور نہیں!
ریاضتوں میں ریاکاریاں ہیں نور نہیں!

جو قوم تھی کبھی خیر الامم زمانے میں
ہے سہمی وہی غیروں کے ناز اٹھانے میں

جو تیرے نام پہ مرتے تھے چل بسے سارے
جو بچ رہے ہیں، وہ ہیں نیم جاں تھکے ہارے

اندھیری رات ہے، بجلی ہے باد و باراں ہے
شکستہ دل تری امت ہے، خوفِ طوفاں ہے

غیور قوم کو غیرت سے واسطہ نہ رہا — حصولِ زر میں حمیت سے واسطہ نہ رہا

نصابِ علم سے قرآں بڑھایا جاتا ہے — کلامِ حق، پسِ مردان پڑھایا جاتا ہے

یہ اپنے ہاتھوں سے، اپنوں کو تنگ کرتے ہیں — فقط زبان و قلم سے یہ جنگ کرتے ہیں

کلامِ تلخ، غرورِ حشم، دل آزاری — سمجھ رہے ہیں اسی کو کمالِ خودداری

جو اہلِ زر ہیں تو فرعونیت بھی طاری ہے — اور ان میں عیب، غریبوں سے رشتہ داری ہے

اب اعتبار کے قابل کوئی حلیف نہیں — کسی کے پاس اگر زر نہیں، شریف نہیں

برائے نام جو مذہب پہ جان دیتے ہیں — لہو بہا کے مسلماں کا، دام لیتے ہیں

مسائلِ نظری میں جھگڑ رہے ہیں خطیب — تڑپ رہے ہیں کشاکش میں سادہ لوح غریب

نہ سوز و ساز، نہ ذوقِ نظر، نہ دل آگاہ!

"کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ؟"

دہائی ہادیٔ برحق! یہ بے حسی کب تک؟ — بسر ہو یوں ہی غلامانہ زندگی کب تک؟

گزشتہ ساری خطائیں معاف فرما دے — قلوب گردِ کدورت سے صاف فرما دے

وہ عہدِ رفتہ کی تابِ نظر عنایت کر
وہ ذوق و شوق وہ قلب و جگر عنایت کر

یہ فرقہ بندیاں آپس کی دور ہو جائیں
فضائیں دہر کی معمورِ نور ہو جائیں

کلی کلی کو بھی ہمدوشِ گلستاں کر دے
تو اپنی قوم کو اک دل اور اک زباں کر دے

مدام ملّتِ اسلامیہ کا راج رہے!
ترے غلام ہیں ہم اس کی تجھکو لاج رہے!

۱۹۴۲ء

التجا

نگاہِ لطف ہم پہ بادشاہِ بحر و بر فرما
کرم، مائل بہ شر بندوں پہ اے خیر البشر فرما

ندامت کیش حاضر ہیں ترے دربار میں آقا
ہماری سن! گزشتہ لغزشوں کو درگزر فرما

مسلمانوں کے چرچے عام ہیں اقوامِ عالم میں
مدد اے پیشوائے دیں! توجہ خاص کر فرما

عجب گمراہ کن تعلیم ہے، تہذیبِ حاضر کی
ہم اپنی راہ کھو بیٹھے خدارا تو نظر فرما

بھٹکتے جا رہے ہیں کفر کی تاریک راہوں میں
تو اے شمعِ رسالت، نورِ ایماں جلوہ گر فرما

مہیا ہو رہے ہیں چار سو ساماں تباہی کے
دہائی ہادیٔ برحق! دلِ مومن میں گھر فرما

ہماری فرقہ بندی دیکھ کر اغیار ہنستے ہیں
مسلمانوں کو یک دل صورتِ شیر و شکر فرما

تحفظ دینِ برحق کا جو سمجھے جان سے بڑھ کر
عطا مسلم کو پھر اگلا سا وہ قلب و جگر فرما

نگاہوں میں ہماری ہیچ ہو نیرنگِ دنیاوی
عنایت پھر ہمیں وہ گمشدہ ذوقِ نظر فرما

بنیں خوددار ہم، وہ جذبۂ ایماں پرستی دے
ہمیں بے چارگی میں آپ اپنا چارہ گر فرما

بدل جائے ہوا، اسلام کا پھر بول بالا ہو
کرم کی اک نظر پھر گلشنِ اسلام پر فرما

۱۹۳۴ء

حضورِ رسالت مآبؐ میں

فریاد ہے! حضورِ رسالت مآبؐ میں
"خیرالامم" ہے، کش مکشِ اضطراب میں

تفصیلِ عرضِ حال سے قاصر زبان ہے
یاں، اب نئی زمین، نیا آسمان ہے

محشر بپا ہے، باہمی جنگ و جدال سے
کیا بے خبر حضورؐ ہیں اُمّت کے حال سے؟

شیرازۂ اخوتِ مسلم بکھر گیا
وہ امتیازِ اُمّتِ خیرالبشر گیا!

اس دور میں جو ملّتِ مسلم کا حال ہے
آثار کہہ رہے ہیں پنپنا محال ہے

کترا کے راہ چلنے لگے رہنمائے قوم
ڈوبے ہیں اختلاف میں خود پیشوائے قوم

قائم کوئی اصول، نہ کوئی نظام ہے
مقصد ہے کوئی، اور نہ کوئی مقام ہے

افکارِ عصرِ نو کی کشاکش میں کھو گئے
شامل رِوایتوں میں فرائض بھی ہو گئے

روزہ، نماز، حج کا فقط احترام ہے
حکمِ زکوٰۃ گویا ابھی ناتمام ہے

ملتا نہیں ہے وقت کسی نیک کام کو
رحلت کے وقت سنتے ہیں حق کے کلام کو

اربابِ سیف ہو گئے رخصت جہان سے
ہوتے ہیں اب جہاد قلم کی زبان سے

خودداریاں نمود و نمائش میں کھو گئیں
حق گوئیاں حیات سے محروم ہو گئیں

مرعوبِ اقتدار ہوئی عدل گستری
قلب و نظر میں بس گیا احساسِ کمتری

روحانیت سے حفظِ مراتب سے بے خبر
آسودگی کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں در بدر

دل میں امنگ ہے نہ طبیعت میں جوش ہے
خوں سرد ہو گیا ہے، حمیت خموش ہے

جینے پہ بس ہے باقی نہ مرنے پہ اختیار
زندہ ہیں، زندہ قوموں میں لیکن نہیں شمار!

یہ کیفیت ہے، امتِ خیر الانام کی
قرآں میں نوید ہے، جس کے دوام کی!

شاہا! یہ دور دورِ قیامت سے کم نہیں
امت کے حال پر تری نظرِ کرم نہیں

اقوامِ غیر راہِ ترقی پہ ہیں رواں
اور دم بخود ہے، ملتِ مسلم کا کارواں

امّت تباہیوں کے اندھیرے میں گھر گئی
چشمِ جہاں سے عظمتِ دیرینہ گر گئی

دل فرطِ غم سے بجھ گئے، آقائے نامدار!
"جینا وہ کیا، جو ہو نفسِ غیر پر مدار"

سامانِ زندگی سے ہے بیگانہ زندگی
صدیوں سے کٹ رہی ہے غلامانہ زندگی

لطف و کرم ہے، فضل ہے غیروں کے حال پر
آشفتہ حال تیرے مسلماں ہیں سر بسر

سرکار! یہ گزارشِ امت قبول ہو!
یہ انفعالِ لغزش و غفلت قبول ہو!

سارے قصور، ساری خطائیں معاف ہوں
مومن کے قلب جہل و کدورت سے صاف ہوں

وہ ذوق و شوقِ عہدِ سلف سرفراز ہو!
پھر زندہ، دینداریٔ قومِ حجاز ہو!

ہے ہم سے تیرے گلشنِ توحید کی بہار
دنیا میں ہم ہیں ختمِ نبوت کی یادگار!

وحدت کا برقرار یہ اعلامیہ رہے
اور یہ بلند ملتِ اسلامیہ رہے

کونین کے نظام پہ ہے تیرا اختیار
تیرے سپرد ہے تری ملت کا اقتدار

قلب و جگر میں گرمیٔ سوزِ تمام دے!
واپس ہمیں دوبارہ، ہمارا مقام دے!!

۱۹۴۵ء

افکار و اذکار

میں اور تو

جاں بہ ہوائے لامکاں، جسم بہ عرصۂ حیات
میری یہی ہے زندگی میری یہی ہے کائنات

واقفِ سوز و درد ہوں ساز ہے میری زندگی
میرے ہی دم قدم سے ہے کارگہِ تنوعات

شورشِ آب و گِل پہ تو سمجھا مدارِ زندگی
محرمِ راز کے لئے مرگ ہے زینۂ حیات

کم نگہی نے کر دیا تجھ کو اسیرِ رنگ و بُو
ایسی حقیر تو نہ تھی، تیری متاعِ واردات

حریتِ سکوں نواز! تیرے نصیب میں کہاں
قلب اگر ٹھہر گیا، بند ہوئی رہِ نجات

واقفِ کفر و شرک ہے، پر نہ کھلا یہ تجھ پہ راز
کس کے رہینِ حکم ہیں میرے دلی تاثرات

اپنے مقام پر اگر تیرا گزر ہو نکتہ چیں
صبح تری ہو روزِ عید شام تری شبِ برات

۱۹۴۰ء

شورشِ حیات

عالم حدیثِ لذتِ غیب و شہود ہے
مقصد نہاں ہے ولولۂ اکتساب میں

ہستی کے تار و پود میں ہے زندگی کی لہر
رقصِ حیات موج کے ہے اضطراب میں

کسبِ کمال و حسنِ عمل کی صعوبتیں
ہیں شادکام زندگیٔ کامیاب میں

سبقت کی یہ اُمنگ اگر ساتھ چھوڑ دے
"پھر کیا دھرا ہے قطرۂ و موج و حباب میں!"

ہر لحظہ اک مظاہرۂ رنگ چاہیے
دنیا کو ہے سکون، اسی انقلاب میں

ہے خامشی و نطق میں در پردہ ارتباط
نغمے تڑپ رہے ہیں سکوتِ رباب میں

ہر دم نرالی آن سے پیدا ہے زندگی
القصہ انقلاب کی شیدا ہے زندگی!

۱۹۳۹ء

فلسفۂ نمود

از ذرّہ تا بہ مہر، ظہورِ عظیم ہے
یہ جذبۂ نمود و نمایش قدیم ہے

حد کوئی کیا بتائے علوم و فنون کی
ہر لحظہ آ رہی ہے صدا کاف و نون کی

دل کارگاہِ حسنِ حقیقت طراز ہے
فکر و نظر میں جلوہ نما کارساز ہے

صنعت گری حیات کی آئینہ دار ہے
خونِ جگر سے نقشِ دوام آشکار ہے

یہ جذبۂ نمود اگر سرد ہو گیا
سمجھو کہ آفتابِ ہنر زرد ہو گیا

سوزِ حیات، زمزمۂ رنگ و بو میں ہے
معراجِ اکتساب، نہاں جستجو میں ہے

"یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے!
طوقِ گلوئے حسنِ تماشا پسند ہے!"

۱۹۴۵ء

نوائے تلخ

جذبات کے طوفاں میں یہ ضبطِ فغاں کب تک
مجبور یہ دل کب تک، مرعوب زباں کب تک

یہ سود کے پردے میں آہنگِ زیاں کب تک
الفاظ کے پھندوں میں اعجازِ بیاں کب تک

آزاد ہواؤں میں پر تول نہیں سکتے
اغیار کے ہاتھوں میں عمرِ گزراں کب تک

اُٹھ جذبۂ خودداری، تا چند زیاں کاری
اُٹھ جوشِ حمیّت اُٹھ! یہ خوابِ گراں کب تک

احساس کی بستی میں جب آگ لگائی ہے
اے سوزِ دروں آخر! نکلے نہ دھواں کب تک

مقصد تری ہستی کا پوشیدہ ہے کوشش میں
یہ نفس کشی تا کے، یہ خوابِ جناں کب تک

جینا ہے تو جینے کے انداز بھی پیدا کر
کام آئیں گے آبا کے یہ نام و نشاں کب تک

کہہ ڈالیں وہ سب آخر کہنے کی جو تھیں باتیں
خاموش بشیر آخر! رہتی یہ زباں کب تک

۱۹۴۱ء

تب و تاب

(ماہ نامہ "شہاب" کی شکایت کے جواب میں)

بجا ہے! اگر مرے وعدوں کا اعتبار نہیں
پہ کیا کروں کہ مجھے خود پہ اختیار نہیں

رہینِ زخمۂ الہام، شاعری میری
محض نمائشِ فن کچھ مرا شعار نہیں

یہ عذر، عذرِ موجہ میں گر شمار نہ ہو
قصور وار بھلا کیوں قصور وار نہ ہو

مجھے تقاضۂ پیہم سے اختلاف نہیں
شکایتوں میں تقاضا پہ صاف صاف نہیں

مگر ہے اصلِ حقیقت کہ پا بہ گِل ہوں میں
رہینِ شعر نہیں، رازدارِ دل ہوں میں

یہ مانا میں نے صحافت ہے ایک گُل چینی
پہ بے نیازِ نمائش ہے میری رنگینی

حصولِ گُل تو ہے آسان گلستانوں سے
سنی ہے ان کی حقیقت بھی نکتہ دانوں سے؟

حدود گرچہ معین ہیں ہر بشر کے لئے
پہ "الکتاب" ہیں یہ صاحبِ نظر کے لئے

خدا کسی کو اگر دے متاعِ قلب و نظر
تو ایک آئینہ خانہ ہے دہر سرتاسر

ہمیشہ رکھتی ہے مضطر مجھے ہوائے سراغ
"نہیں ہے بندۂ حُر کے لئے جہاں میں فراغ"

عطا کیا یدِ قدرت نے اک شرارہ مجھے
ملی یہ روزِ ازل شوخیٔ نظارہ مجھے

رفیقِ راہِ طلب، جب مرا جنون ہوا
خرد خفیف ہوئی قلب کو سکون ہوا

ہے تازیانۂ غفلت، خرد کی رُوباہی
مرے جنوں کے لئے ہے فریبِ آگاہی

نپا رہا ہے مجھے سوزِ ناتمام مرا
کسی مقام پہ رہتا نہیں قیام مرا

اک اضطرابِ مسلسل حیات ہے میری
بس ایک ذوقِ نظر کائنات ہے میری

مری نگاہوں سے قائم ہے حسن کی تاثیر
مری نواؤں سے زندہ ہے زندگی کا ضمیر

گدازِ شمع بنا، ذوقِ جستجو میرا
بسانِ آب، رگِ گُل میں ہے لہو میرا

مرے نفس سے روانی ہے موجِ کوثر کی
ازل سے تابہ ابد زندگی ہے دم بھر کی

یوں ہی سفینۂ ہستی مدام کھینا ہے
نظامِ دہر کا ہر وقت ساتھ دینا ہے

معاملہ ترا دوچار مشکلات سے ہے — مری حیات تو وابستہ کائنات سے ہے
تری نظر میں مری زندگی شکایت ہے — مری نظر میں ہی سر بہ سر حکایت ہے

گزر کے سیلِ حوادث سے بیکراں ہو جا!
بدعہد بن کے مری طرح، لازماں ہو جا!

۱۹۳۹ء

نظامِ ہستی اور ہم

صنفِ نازک جسے کہتے ہیں یہ اربابِ نظر — ہے اسی ذات پہ قوموں کی ترقی کا مدار
کیا غضب ہے کہ کریں مرد ترقی حاصل — اور عورت رہے یوں جہل و فلاکت پہ کنار
لازمی ہے کہ بنے قابلِ خدمت یہ بھی — کام کیونکر وہ کرے جس کا ہو بازو بیکار
آہ مضبوط اگر بندشِ بنیاد نہیں — کام کیا آئے گی پھر قوتِ فنِ معمار

اپنی تاریخ پہ جس وقت نظر پڑتی ہے
ہم پہ ہوتے ہیں عیاں اپنے نمایاں کردار

کس قدر زود فراموش ہے بے حس دنیا
آج کہتی ہے ہمیں ناقص و عضوِ بیکار

کارآمد رہے ہم کارگہِ ہستی میں
ہر زمانہ میں مسلّم رہا اپنا ایثار

تھا قدم عالمِ اسلام میں پہلا کس کا؟
کس کی جرأت پہ تھے انگشت بدنداں کفار؟

تھے وہ آغشتہ بہ خوں کس کے جگر کے ٹکڑے
جن کے ایثار کا اب بھی ہے مقر ہر دیندار؟

چاند بن کر کیا دنیا کو منوّر کس نے
کس نے اکبر کے مقابل میں اٹھائی تلوار؟

کس کے افسانے سے توقیر ہے جھانسی کی سوا
سطوتِ نور جہاں سے ہے کسی کو انکار؟

کس کے تسخیرِ عمل کا ہے گواہ "تاج محل"
اور یہ گوشہ محل کس کی ہے چاہت کا مزار؟

یاد رکھو! کہ ہے یہ عالمِ ہستی ہم سے
ہم جو مٹ جائیں، تو مٹ جائیں گے یہ لیل و نہار

۱۹۳۸ء

فریضۂ اُمّہات

جوہر ہزار علم و ترقی کے ہم دکھائیں
لیکن یہ فرض ہے کہ فریضہ نہ بھول جائیں

تعلیم گرچہ عام سہی، پر یہ عرض ہے
بچّوں کی تربیت بھی تو عورت پہ فرض ہے

قایم وجودِ زن ہی پہ غیرت ہے قوم کی
ان ناتوان ہاتھوں میں عزّت ہے قوم کی

عورت سے ہے مکان، مکانوں سے شہر ہے
شہروں سے ملک، ملک سے قایم یہ دہر ہے

روزی، معاش، رزق کمانے میں کچھ نہیں
عورت ہی جب نہیں تو زمانے میں کچھ نہیں

۱۹۴۲ء

عورت

دیار و ممالک ہیں مربوط اس سے
بنائے محبت ہے مضبوط اس سے

نہ ہی سیم و زر سے، نہ دام و درم سے
یہ دُنیا ہے آباد، عورت کے دم سے

نشانِ تمدن مدارِ معیشت
ہر اک کامرانی ہے اس کی بدولت

حیات اس کی، یکسر حیات آفریں ہے
دل اس کا فروزاں، نگہ آتشیں ہے

جُدا اس کا مذہب، عقیدت انوکھی
نرالا تصور، شریعت انوکھی

ہر اک سانس میں، حاملِ زندگی ہے
وجود اس کا تفسیرِ درماندگی ہے

فضاؤں میں رنگینیاں ہیں اسی سے
یہ انوارِ کون و مکاں ہیں اسی سے!

۱۹۴۳ء

بیداریٔ اناث

عورت کے دم سے کہتے ہیں نظمِ حیات ہے
مجبور کیوں زمانے میں پھر اس کی ذات ہے؟

اعلائے حق پہ، حق کی حمایت پہ بس نہیں
علم و ہنر پہ، فکر پہ، جدّت پہ بس نہیں
قلب و نظر پہ اور عقیدت پہ بس نہیں
حد ہو گئی کہ عزم پہ ہمّت پہ بس نہیں

ہر لحظہ نکتہ چینیوں کو اسکی تلاش ہے
کیا موردِ بلا یہی اک زندہ لاش ہے؟

درماندہ زندگی کی یہ رفتار تابکے؟
حالِ زبوں پہ خندۂ اغیار تابکے؟
یہ ناروا طریقۂ ایثار تابکے؟
اس صنف پر رہے گا یہ ادبار تابکے؟

تقدیر سے، فلک سے نہیں، دور سے نہیں!
شکوہ خود آپ سے ہے کسی اور سے نہیں!

عہدِ سلف میں کیا کبھی بیکار ہم رہے؟ تاریخ ہے گواہ کہ بیدار ہم رہے!
باطل کے آگے برسرِ پیکار ہم رہے پابندیوں کے ساتھ بھی خود دار ہم رہے

ہر شعبۂ حیات میں حاصل مقام تھا۔!
ملّت کی آبیاری ہمارا ہی کام تھا۔!

میں دورِ نو کے ذوقِ ترقی سے خوش نہیں کڑھتا ہے دیکھ کے میرا دلِ حزیں
آماج گاہِ شر ہوئی اللہ کی زمیں اِک شورشِ حیات ہے، نے سوزِ یقیں

بخشی گئی نگاہ وہ عہدِ جدید کو!
پہچانتی نہیں جو سیاہ و سفید کو!

آسودگی نہاں ہے ضروری قیود میں ہے پاگل حیات، جہانِ نمود میں
اپنی جگہ ملے ہمیں، بزمِ وجود میں آزاد ہم رہیں، مگر اپنی حدود میں

ناموس و اقتدار کا مفہوم اور ہے!

آزادیٔ اناث کا مفہوم اور ہے!

بے کیف ہے حیات اگر علمیت نہ ہو
تعلیم ہے فضول اگر تربیت نہ ہو

انساں نہیں وہ جس میں کہ انسانیت نہ ہو
بے سود ذوق و شوق ہے جب کیفیت نہ ہو

آزادیوں کی جنگ میں مصروف ہے جہاں

سیرت گری میں راز ترقی کے ہیں نہاں!

عالم پہ علم و فن کے حقایق ہیں آشکار
مکتب بھی، مدرسے بھی ہیں کالج بھی شاندار

اہلِ کمال بھی ہیں اتالیق باوقار
تادیب و تربیت کی مگر، ماں ہے ذمہ دار

نااہل را مپرس کہ نااہلیت شد!

"آنکس کہ خود گم است کرا رہبری کند؟"

روحِ عمل ہو طبقۂ نسواں میں گرواں
ہر گھر سے دور جہل و فلاکت کا ہو نشاں

تعلیم و تربیت سے مرصع ہر ایک ماں
ملت کے آگے پیش کرے حیدرؓی جواں

بیداریٔ اناث کی اب احتیاج ہے!
امراضِ قوم کا یہی واحد علاج ہے!

بچوں کی تربیت کا تہیّہ کریں جو ہم! خوابِ گراں سے جاگ اٹھے قسمتِ اُمم
خدمت ادا جو کرتے ہیں یہ ناتواں قدم کرتے نہیں وہ کام شہنشاہوں کے قلم

ماں کی سرشت جذب ہے بچوں کے ڈھنگ میں
رنگتی ہے اپنی پود کو ماں اپنے رنگ میں!

انسانیت نواز ہے عورت کی زندگی خاموش وکارساز ہے عورت کی زندگی
جاں بخش ایک ساز ہے عورت کی زندگی خود زندگی کا راز ہے عورت کی زندگی

اس کا وجود واقعی سیرت نواز ہے!
ہے مجتہد وہی، وہی ملّت نواز ہے!

۱۹۴۴ء

احساسِ فرض

(شہزادہ معظم سے تاناشاہ کی دو دو باتیں)

بتاؤں کیا تجھے اے نورِ عینِ عالمگیر
کہ تاج و تخت بھی کھو کر نہیں ہوں میں دلگیر

جو پوچھتے ہو تو کہتے ہوئے بھی عار نہیں
بتاؤں؟ کس لئے دل میرا بے قرار نہیں

نہیں جو کرب نمایاں بہ لوحِ پیشانی
سبب یہ ہے کہ ہے دل خوگرِ پریشانی

تاثرات کی جاذب ہے فطرتِ بشری
محیطِ قلب پہ قادر ہے وسعتِ نظری

تغیرات سے مجھ کو کوئی ملال نہیں
کمال ہے کوئی ایسا جسے زوال نہیں؟

نہیں ہے رنج مجھے سلطنت کے جانے کا
نہیں ہے خوف مجھے سختیاں اٹھانے کا

مصیبتیں جو پڑیں گی خوشی سے جھیلوں گا
یہی ہے حکمِ قضا تو میں جاں پہ کھیلوں گا

طلائی نقرئی محلوں کی چاندنی راتیں
مجال کیا ہے زباں پر جو آئیں وہ باتیں

نظر نہ آئیں گے آرائشوں کے خواب کبھی
خیالِ خام سے ہوگا نہ اضطراب کبھی

جہاں میں دیکھی تھی شاہی و برتری میں نے
یہ آج دیکھ لی مالک کی داوری میں نے

گواہ ہیں اسی شاہی محل کے بام و دَر
ہوں آج جانے پہ مجبور کل تھا آنے پر

سرِ نیاز ہے خم، جو وہ بے نیاز کرے
ذلیل و خوار کرے یا کہ سرفراز کرے

مگر ستائے گی اک فرض کی پکار مجھے ق
سدا رکھے گا یہ احساس بے قرار مجھے

دیا فریب نہ دل کو کبھی امارت کا
نہ سمجھا اپنے تئیں مستحق ریاست کا

نہ سر میں آنے دیا زعم بادشاہت کا
کہ میں امیں تھا قطب شاہوں کی امانت کا

کھلا جو دیتا یہ احساسِ فرض، میرا ضمیر
تو زحمتیں نہ اٹھاتی یہ فوجِ عالمگیر

تھا میرا فرض ریاست کروں سپرد اس کے
بدن میں خونِ قطب شاہی ہو رواں جس کے

ولے مآل اگر حسبِ مدّعا نہ ہوا
خدا کا چاہا ہی آخر ہوا۔ بُرا نہ ہوا

۱۹۳۹ء

دریوزۂ آزادی

(گاندھی جناح ملاقات کے بعد)

مفہومِ غیر فہم کی تفہیم کیا کریں ؟
خالی ہوں جن کے ہاتھ وہ تقسیم کیا کریں

نیرنگِ اصطلاح میں الجھا ہوا ضمیر
مطلب نگار خانۂ الفاظ میں اسیر

بانگِ رحیل کیوں نہ قیادت پہ بار ہو
احساسِ فرض، فرض کو جب ناگوار ہو

میری نظر میں قابلِ تحسیں ہیں وہ دماغ
روشن ہیں جن کی فکر سے امید کے چراغ

کیا کم ہے یہ کہ کشمکشِ بیش و کم تو ہے
اعزاز و سربلندی کا باقی بھرم تو ہے

اوروں سے آج مانگ رہے ہیں ہمارے ہاتھ
وہ حق جو ساتھ لائے ہیں اپنے جنم کے ساتھ

درشن کی پیش رفت میں یاں انتشار ہے
اور شانتی کی دیوی سمندر کے پار ہے

دورِ جدید مضحکۂ اضطراب ہے
خود انقلاب منتظرِ انقلاب ہے

ہمت شکن نہیں، یہ حوادث، یہ مرحلے!
ناداں! یہ ہیں طلسمِ سیاست کے زلزلے! ۱۹۴۴ء

دل کی دنیا

کیا غم کی حقیقت ہے؟ کیا کیا ہے مرے دل میں
آتش ہے مرے دل میں، دریا ہے مرے دل میں

بربادِ تمنا کیا، آباد نہیں ہوتے؟
ہر لحظہ غمِ تازہ، پیدا ہے مرے دل میں

کیا جانیے تو اے ناداں، کیا دل کی حقیقت ہے
ہر روز نیا عالم، برپا ہے مرے دل میں

وسعت کو نہ پوچھ اسکی، عالم نہیں تہ دل ہے
سرمستیٔ عرفاں کی دنیا ہے مرے دل میں

جو اٹھ نہ سکا ہرگز اربابِ ملائک سے
وہ بارِ گراں دیکھو، رکھا ہے مرے دل میں

امروز جو حاصل ہے، فردا کی ضرورت کیا
ہنگامۂ محشر اک، برپا ہے مرے دل میں

جو طور کا حاصل تھا، جو ضرب سے بالا تھا — معبودِ کلیم اللہ، رہتا ہے مرے دل میں

رُخ ہوتے ہیں پھولوں کے، جس درد سے پژمردہ — وہ درد مگر پہلے، اٹھتا ہے مرے دل میں

دریاؤں کی طغیانی حیراں نظر آتی ہے — جب پچھلی پہر طوفاں اٹھتا ہے مرے دل میں

اک نغمۂ لاہوتی، سکھلاتا ہے مدہوشی — جب عالمِ بالا سے آتا ہے مرے دل میں

جس شعلہ نوائی سے، دل ہوتے ہیں سیمابی — وہ نالۂ غمِ اوّل، آتا ہے مرے دل میں

اک پردۂ غفلت سے، روپوش ہوں میں ورنہ — ہر ذرّۂ دو عالم، بستا ہے مرے دل میں

جرأت ہے بھلا کس کی؟ تردید کرے میری

اللہ کی قدرت کا جلوہ ہے مرے دل میں!

۱۹۳۹ء

آتما رنگ

اس دیس کی چاہت فانی ہے — یاں حسن و وجاہت فانی ہے
یاں جنگ و رقابت فانی ہے — یاں امن و اقامت فانی ہے

جس دیس میں آنی راج نہیں
اس دیس میں چل سنسار کریں

یاں جنبشِ تغیّر ستی ہے — یاں خوفِ بلند و پستی ہے
فطرت بھی رہینِ ہستی ہے — یہ وہم و گماں کی بستی ہے

جس دیس میں آنی راج نہیں
اُس دیس میں چل سنسار کریں

پھولوں کی لطافت جھوٹی ہے　　　شبنم کی طراوت جھوٹی ہے
یہ پریم یہ چاہت جھوٹی ہے　　　یہ روپ یہ رنگت جھوٹی ہے

جس دیس میں آنی راج نہیں
اُس دیس میں چل سنسار کریں

"سکھ دیس" کو چل، ہاں دیر نہ کر　　　چل چھوڑ چلیں یہ پھوٹ نگر
رکھ تیز قدم! بجتا ہے گجر　　　ہے کتنا مبارک اپنا سفر

جس دیس میں آنی راج نہیں
اُس دیس میں چل سنسار کریں

واں گردشِ صبح و شام نہیں　　　واں حزن نہیں، آلام نہیں
آغاز نہیں، انجام نہیں　　　انسان جہاں ناکام نہیں

آنند بھی ہو آرام بھی ہو
اُس دیس میں چل سنسار کریں　　　سنہ ۱۹۴۰ء

بیچارگی!

سیلاب زندگی میں بہے جا رہے ہیں ہم
بے دست و پا ہیں اور بڑھے جا رہے ہیں ہم

اس میں جو کیفیت ہے ہمیں جانتے ہیں کچھ
منزل سے بے خبر ہیں چلے جا رہے ہیں ہم

یہ جانتے ہیں لطفِ فسانہ نہیں رہا
پھر بھی فسانہ اپنا کہے جا رہے ہیں ہم

ہے واسطہ خوشی سے نہ غم سے کوئی گلہ
ایسا ہے سہتے جاؤ، سہے جا رہے ہیں ہم

درسِ خودی ہے، یا کہ ہیں یہ بیخودی کے راز؟
کوئی پڑھا رہا ہے، پڑھے جا رہے ہیں ہم

اپنی نظر پہ آپ اگرچہ ہے اعتماد!
پھر بھی قدم قدم پہ رُکے جا رہے ہیں ہم

گو تلخیٔ حیات سے ہر گھونٹ زہر ہے
ہے زندگی کا پاس، پیے جا رہے ہیں ہم

تہذیبِ نو کے کھیل، عجب کھیل ہیں اثیرؔ
راہِ عمل سے دُور ہوئے جا رہے ہیں ہم

۱۹۴۳ء

ننھا پودا

قلبِ زمیں کی — گہرائیوں میں
نشوونما کی انگڑائیوں میں
سویا ہوا تھا آہنگِ ہستی —
مٹی کی تہہ میں — مانوسِ پستی !

باراں کے قطرے، رس کر برس کر
بولے، لہک جا، رُوئے زمیں پر
— سورج کی گرمی، چھن چھن کے آئی

بولی کہ ــــ اٹھ جا ــــ لے روشنائی،

ٹھنڈی ہوائیں نزدیک جا کر، کہنے لگیں یہ

اُس کو جگا کر:

"اُٹھ جا رے ننھے ـــــ اُٹھ

لہلہا جا ـــ اُٹھ، انکھڑیوں میں بس جا

سما جا!" ـــــــ

ـــــ ذوقِ نمو نے روپ نکالا

بل کھا کے اٹھا ننھا سا پودا!

ٹل ٹل کے آنکھیں حیرت سے دیکھا

آکاش ۔ دھرتی ۔ کہسار ــــ دریا!

ہر سمت دیکھیں ــــ دلکش ادائیں

ـــــ دنیا کی ہلچل! ــــ رنگیں فضائیں

—— لہرا گیا وہ، فرطِ خوشی سے
اب اس نے جانے —— گُر زندگی کے! —— ۱۹۴۱ء

نجمِ سحر

نجمِ سحر! بتا تجھے اللہ کی قسم
کس سوچ میں ہے تو؟ کہ بڑھتا نہیں قدم

چھپتے نہیں چھپائے سے اندازِ سوزِ غم
اس درجہ کیوں اداس ہے اے پیکرِ الم

تاروں کے قافلے گئے رخصت ہوا قمر
شب زندہ دار ہو گئے دنیا سے بے خبر

افسردہ کس کی یاد میں اب تک کھڑا ہے تو
ہاں کن توہمات میں اُلجھا ہوا ہے تو؟

اے بے خبر، خبر ہے مجھے تیرے حال کی
معلوم مجھ کو وجہ ہے تیرے ملال کی

یہ خوفِ مرگ جس سے ہے لرزاں ترا وجود
میرے جنونِ شوق میں ہے خواہشِ نمود

تابع یہ کائنات ہے میرے جنون کی
بود و نبود میں ہے کشش کاف نون کی

تو چاہتا ہے دیکھنا کیا ہوگا اب یہاں
بے انجم و قمر، نظر آئے گا کیا جہاں؟

وہ دیکھ! کرنیں آتی ہیں کیا دور دور سے
دنیا چمک اٹھی، شہ خاور کے نور سے

پھر گرم ہوگی کل کی طرح بزمِ کائنات
گردش کریں گے جامِ اجل، ساغرِ حیات

سورج غروب ہوگا تو پھر شام آئے گی
تاریک رات پھر وہی جادو جگائے گی

قائم نظامِ دہر، تنوع کے بل پہ ہے!
ثابت قدم وہی ہے، جو خندان اجل پہ ہے!

۱۹۳۹ء

نویدِ امن

(جشنِ فتح کے موقع پر)

تقدیر نے دُہرایا، فطرت کا نصاب آخر
"شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر"

صورت گرِ فردا ہے، یہ جشنِ ظفر یابی
پھر خاورِ مغرب ہے مصروفِ جہاں تابی

ہے شور کہ پھر امن و آرام کے دن آئے
برسوں میں کہیں جا کر نالے یہ اثر لائے

شل ہو گئی جانکاہی، اور تھم گئی خونریزی
یوں ختم ہوا دورِ افسانۂ چنگیزی

آزاد فضاؤں میں بے خوف ہیں طیارے
یاد آ گئے پھر سارے بھولے ہوئے نظارے

یہ امن کی خبروں میں سکھ چین کے منصوبے
دل فرطِ مسرّت سے یارب نہ کہیں ڈوبے

ہے خوف کہ ہنسنے میں آنسو نہ نکل آئیں
خونریز وہ افسانے ذہنوں سے نہ مٹ جائیں

اوہام و تذبذب کی اب تاب نہیں یارب
اس امن پہ مجھ کو بھی آجائے یقیں یارب! سنہ ۱۹۴۵ء

اوٹی

سرگوشیوں میں غرق ہیں کہسار و آسماں
رنگینیوں میں ڈوبے ہیں فطرت کے راز داں

بستی ہے بادلوں کی، ترنم کا دیس ہے
اس سرزمیں پہ ہوتا ہے فردوس کا گماں

ہیں جا بجا کرشمۂ قدرت کے شاہکار
رہ رہ کے جگمگاتے ہیں انوارِ لامکاں

رقصاں ہے مرغزاروں کے حسنِ سکوت پر
کہسار کی جبینوں سے اُٹھتا ہوا دھواں

شفاف آبشار سمندر کے ہیں سفیر
ہیں جن کے انتظار میں پھولوں کی وادیاں

ہے کارگاہِ ابرِ گہربار، یہ دیار
شادابیوں کے یاں سے گزرتے ہیں کارواں

سرشار ذرّہ ذرّہ ہے کیفِ حیات سے
ہر جنبشِ نظر ہے تاثر کی داستاں

جچتی نہیں ہیں، روئے زمیں کی بلندیاں
یاں زندگی بدلتی ہے رُخ سوئے آسماں

لاریب! یہ مقام وطن ہے بہار کا!
جس کی خنک فضاؤں میں ہے سوزِ جاوداں!

سنہ ۱۹۴۶ء

ربابِ حیات

موجِ بقا کہیں، کہیں نقشِ ثبات ہے
ہر سمت نغمہ ریز، ربابِ حیات ہے

تنویرِ روح، عکس ہے حسنِ دوام کا
دنیا طلسم گاہِ حیات و ممات ہے

ہر لحظہ ایک عالمِ نو کا ظہور ہے
معمورۂ جنوں میں نہ دن ہے نہ رات ہے

ذوقِ نظر سے باقی ہے یہ حسنِ کائنات
دل کارگاہِ تاب و تبِ واردات ہے

پوشیدہ گو، نگاہوں سے ہی دہر آفریں
لیکن محیطِ دہر، وہی ایک ذات ہے

ٹوٹی ہوئی اُمیدوں کی غمناک داستاں
دنیائے انبساط کی تاریک رات ہے
افسانے بن رہے ہیں عروج و زوال کے!
صورت گرِ حیات، مآلِ حیات ہے! سنہ ۱۹۴۶ء

ترقی پسند فن کار سے

اے ہمصفیر! گو تری پرواز ہے بلند
لیکن! بتا کسی کو ترقی ہے نا پسند؟
میری نظر سے تیرے مقاصد نہاں نہیں
تیرے خلوصِ عزم سے میں بدگماں نہیں
ہے تلخئ حیات سے معمور تیرا جام
تیری نظر میں قہر ہے بے ربطئ نظام
تیری نوا میں جذب ہے آوازِ زندگی
تیرے تفکرات ہیں دم سازِ زندگی
دل تیرا کائنات کا آئینہ دار ہے
تیری صدا شکستہ دلوں کی پکار ہے

فطرت کو تو نے طرزِ تکلم سکھا دیا　　احساسِ زندگی کو ادب میں بسا دیا
لیکن سمجھ رہا ہے یہ سارا زمانہ کیا؟
"کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟"

سن! میں بتاؤں اصلِ حقیقت عتاب کی　　اور اہلِ فن کی برہمی و اجتناب کی
وابستہ ہے جو شیشہ گرانِ ہنر سے تو　　ہے دُور دُور اس لئے اہلِ نظر سے تو
رشحاتِ فکرِ خام کا تو پردہ دار ہے　　مہمل نگارشات کا خود اشتہار ہے
چھوٹے نگوں کی عام ہوئیں ریزہ کاریاں　　نا اہلیت بھی زعمِ ہنر میں ہے سر گراں
سطحِ ادب تباہی کی آماجگاہ ہے　　اور شرمسار عفّتِ قلب و نگاہ ہے
تنگ آگئی ہے، فکرِ فرومایہ سے نظر　　ہے مرگِ ذوق، یہ ترا اندازِ درگزر!
ذہن میں کرگسوں کے جو شاہین کا نام ہو　　چرچا نہ کیوں ضمیر فروشی کا عام ہو
محصور کر رہا ہے تجھے تیرا حسنِ ظن!　　تو دل شکن نہیں، ترا عنواں ہے دل شکن
ہے مضمحل ضمیر ترا قید و بند میں　　ناحق الجھ رہا ہے طلسمِ پسند میں

اس طرح اپنے خونِ جگر کو تلف نہ کر
فطری صلاحیت کے تحفظ پہ کر نظر!

"جس کی بہار تو ہو، یہ ایسا چمن نہیں
قابل تری نمود کے یہ انجمن نہیں"؟

ہر دور اپنے دور میں، خود مجتہد رہا
مقصد حیاتِ نو کا سدا متحد رہا

فرق و تمیزِ رنگ و اثر ناگزیر ہے
ہر ذوقِ تندرست، ترقی پذیر ہے!

تابندہ یہ جو کاخِ علوم و فنون ہے
دیکھ اس کے بند بند میں کس کس کا خون ہے؟

تیرے بیان، تیرے قلم کی ہے جو زباں
وہ خود ہے انقلابِ مسلسل کی داستاں

نقشِ دوام، گرمیٔ خونِ جگر سے ہے
یہ ارتقائے فن، تب و تابِ ہنر سے ہے

کسبِ کمال، سلسلۂ ناتمام ہے
معماریٔ سلف کا تو قائم مقام ہے

اسرارِ کائنات کا فنکار ہے امیں
اخلاصِ عالی سے ہے پیدا دمِ یقیں

شاہیں کو احتیاجِ نشیمن نہ انجمن
ہے شاہباز کے لئے سارا جہاں چمن

تو اپنی جاں فشانی کا عنواں بدل کے دیکھ!
جوہر پھر اپنی ندرتِ فکر و عمل کے دیکھ!

بن کر سحابِ فیض زمانے پہ چھائے جا — انسانیت نواز ترانے سنائے جا

افکارِ نو میں وحدتِ نوعی تلاش کر — اور سرمدی حیات کے اسرار فاش کر

تیرا پیام فکر و نظر عالمی رہے — سر رشتۂ فروغِ عمل باہمی رہے

پیدا جہانِ تازہ ہو تیری نگاہ سے — روشن ہو چشمِ دہر، تری جلوہ گاہ سے

وابستہ تیرے دم سے ہے رنگینیٔ حیات — تیرے لہو سے گرم و رواں روحِ کائنات

احسان کر، رعونتِ احساں کو بھول جا — سوزِ یقیں میں، شہرتِ ارزاں کو بھول جا

ذوقِ سفر پہ عشرتِ منزل حرام ہے!

تیرا تو ہر مقام سے آگے مقام ہے!

سنہ ۱۹۴۵ء

امید و بیم

(موجودہ حالات کی روشنی میں)

کیا خبر، صورتِ امروز کا، کیا ہو انجام
"کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام"؟

لیکن، اتنا تو سمجھ سکتے ہیں اربابِ نظر
زندگی، عین دوراہے پہ کھڑی ہے ششدر

ایک جانب، وہی دریوزہ گری کے پیماں
دوسری سمت ہیں، خونریز تباہی کے نشاں

گرچہ آفاق سے پیدا ہیں سحر کے آثار
پر، فضاؤں میں ہے شمشیر و سناں کی جھنکار

صبحِ نو، زندگیٔ نو کی پیامی ہوگی
یا تو پھر، اور بھی مضبوط غلامی ہوگی!

ہم سفر آج، رواں گرچہ سوئے منزل ہیں
باہمی ربط کے احساس سے خالی دل ہیں

اختلافات کے طوفاں میں بنے عیب ہنر   تنگ خود آگئی، اس تنگ نگاہی سے نظر

گرم بازار ہوا، کش مکش باہم کا   آہ، ارزاں ہوا، کس درجہ لہو آدم کا

گم ہے ہنگامۂ پیکار میں آوازِ ضمیر   کھو گیا مصلحتِ وقت میں حسنِ تدبیر

ہے ابھی پردۂ تقدیر میں وہ رازِ حیات   جس کی تابانی پہ موقوف ہے قوموں کی نجات

کام کیا آئیں گے، یہ سود و زیاں کے اوہام؟

وحدتِ افکار کی، بے وحدتِ کردار ہے خام"!   سنہ ۱۹۴۷ء

فکرِ امروز

فضا بدلی، مخالف بن گیا ہے آسماں اپنا
کھٹکتا ہے نگاہِ دہر میں نام و نشاں اپنا

اکھٹے ہو رہے ہیں چار سو ساماں تباہی کے
ابھی تک بے خبر، اور منتشر ہے کارواں اپنا

مخالف ہیں ہوائیں، گل پریشاں، باغباں برہم
کہاں اور کس توقع پر بنائیں آشیاں اپنا

زمانے میں کبھی ہم بھی، پرِ پرواز رکھتے تھے
نشانِ لامکاں تھا، جب یہی ویراں مکاں اپنا

وہی ہم ہیں کہ اب اپنی کوئی سنتا نہیں ورنہ
مسلط سارے عالم پر تھا رنگِ داستاں اپنا

ہماری آشیاں بندی کے منصوبوں کو سن سن کر
تعاقب کر رہی ہیں ہر قدم پر بجلیاں اپنا

قیادت اختلافِ رائے سے قائم نہیں رہتی
پلٹ آتا ہے تھوڑی دور جا کر کارواں اپنا

بشیر امید کیا رکھیں چمن میں ہمصفیروں سے
لگائی آگ اپنوں نے، جلا جب آشیاں اپنا!

۱۹۴۷ء

مصوّرِ فطرت خواجہ حسن نظامی

(شمس العلماء کا خطاب ملنے پر)

انسانیت نواز ہو، انساں کی زندگی
سوزِ حیات میں ہے نہاں رازِ بندگی

اس دور میں جو عام ہوئیں فرقہ بندیاں
ہر کارواں ہے طرزِ قیادت سے بدگماں

پھر کشمکش ہے طرزِ جدید و قدیم کی
دنیا تلاش میں ہے رہِ مستقیم کی

ہر سمت اختلاف سے برپا فتور ہے
"کچھ اور آج کل کے کلیموں کا طور ہے"

دیں دار کوئی ہے تو جہاں ساز ہے کوئی
ہے کوئی صرف رنگ تو آواز ہے کوئی

لیکن زمانہ اہلِ نظر سے تہی نہیں
کمیاب ہے، مگر ہے ابھی دولتِ یقیں

بیمار کے مزاج سے واقف ہو چارہ گر
حکمت کی روح، نبض شناسی کا ہے ہنر

بے ربطئ شعور سے بیتاب فکر ہے!
خواجہ حسن نظامی کا مقصود ذکر ہے!

جن کا وجود قابلِ صد احترام ہے — کُل ہند کی زباں پہ سدا جن کا نام ہے

جن کی نگاہ، دین و سیاست کی پاسباں — جن کا دماغ، عالمِ ماضی کی داستاں

اس طرز و طور کے بھی انسان ایک ہیں — جن کی نظر میں سارے مسلمان ایک ہیں

مسلک میں جن کے غم سے گزرنا بھی سہل ہے — مذہب بھی سہل، جینا بھی، مرنا بھی سہل ہے

درویش بھی، غنی بھی ہیں، روشن ضمیر بھی — تاجر بھی اور طبیب بھی، قابل مدیر بھی

مرشد بھی، مجتہد بھی، مفکّر ادیب بھی — خوددار بھی، خلیق بھی اور خوش نصیب بھی!

جن کی نگارشات کی ممنون ہے زباں — جن کی زباں سیاستِ فطرت کی ترجماں

محفل میں، خانقاہ میں، ایوان میں عزیز — قدرت نے دی ہے مصلحتِ وقت کی تمیز

اس عمر، اس قویٰ پہ یہ انبار کام کا! — اور گرد و پیش ہجوم سدا خاص و عام کا!

ہر سانس تازہ فکر و عمل کا پیام ہے — ہر لحظہ اک پیامیٔ نقشِ دوام ہے

کیا ہوں بیاں، مصوّرِ فطرت کی خوبیاں — اس ایک دم سے عظمتِ دلی کے ہیں نشاں

گرویدۂ صفات ہیں، زاہد بھی، رند بھی — قائل تھا ہند، ہو گیا بیرونِ ہند بھی

سوزِ حیاتِ قلب و نظر بے نقاب ہے　　منظہرِ تجلّیات کا شمسی خطاب ہے!

ہو بارگاہِ خواجہ میں یہ پیش کش قبول!

برطانیہ نے بھیجے ہیں سورج مکھی کے پھول! 　سنہ ۱۹۴۶ء

قائدِ اعظم

آزادئ حیات کا اُبھرا ہے آفتاب!
قلب و نظر میں جذب ہوئی جس کی آب و تاب!
دیرینہ اضطراب، سکوں سے بدل گیا
گرداب سے سفینۂ ملّت نکل گیا
قابو میں انقلاب ہے اور بس میں زندگی
پابندیوں سے ہوگئی آزاد بندگی!
چھائی جہاں پہ قائدِ اعظم کی جستجو
ہندوستاں کو مل گئی گم گشتہ آبرو!

وابستۂ جناح، دلِ شیخ و رند ہے
چھایا ہوا زمانہ پہ وہ شیرِ ہند ہے!

جس کی زباں ہے وحدتِ مسلم کی ترجماں
جس کا دماغ، عزمِ مسلماں کی داستاں

جس کی نگاہِ قہر سے برپا ہوں زلزلے
لرزاں ہیں جس کے عزم سے سنگین مرحلے

حق گوئیاں بدلنے کے امکان ہیچ ہیں
خودداریوں کے سامنے طوفان ہیچ ہیں

بڑھ کر شہنشہی سے ہے یہ دولتِ یقیں
محتاجِ تخت و تاج محمد علیؒ نہیں!

ہے تابناک رُوح جو اقبالیات میں!
گرم و رواں ہے قائدِ اعظم کی ذات میں!

اے آفتابِ ہند! سیاست کے شاہکار
دنیا پہ تیرے نام کی عظمت ہے آشکار
ہر دل عزیز، سحر بیاں، مستقل مزاج
نے تخت ہے نہ تاج، مگر ہے دلوں پہ راج!
دم سے ترے اُخوّتِ دیں کو ثبات ہے
"تیرا یہ سوز و ساز، سراپا حیات ہے!"
خوابیدہ زندگی کو ملا، سوزِ زندگی
تو نے دلوں پہ کھولے ہیں اسرارِ بندگی!
پڑتا ہے دل پہ رعب ترے پاک نام سے
دشمن بھی ذکر کرتے ہیں کس احترام سے
فرمان کا ترے کبھی ٹلنا محال ہے
دنیا کو تیری رائے بدلنا محال ہے!

ہر سانس تیری ہند کی دمساز بن گئی
آواز تیری، قوم کی آواز بن گئی!

حیران سب ہیں تیرے تدبّر کے روبرو
قائم ہے تجھ سے ملّتِ مسلم کی آبرو!

روزِ ازل انوکھی سعادت لکھی گئی
قسمت میں تیری، قوم کی قسمت لکھی گئی!

وابستہ زندگی ہے دمِ زندگی کے ساتھ
ہر کلمہ گو، رواں ہے محمد علیؒ کے ساتھ!

یارب! ہمارا قائدِ اعظم سدا رہے!
اس رہنمائے قوم کا تو رہنما رہے!
۱۹۴۶ء

مرشدِ معصوم

(کمسن سجادہ سید تقی الدین خلف ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی مسند نشینی پر)

اے تقی الدین ! اے معصوم سجادہ نشیں !

یادگارِ سالکیں، اے وارثِ علم الیقیں !

چرخِ عرفاں پر چمک اٹھا ہے تو اے ماہِ نو

بدرِ کامل بن کے عالمگیر ہو گی تیری ضو

یہ بر و مندی، درخشاں دور کی تمہید ہے

تیری ہستی عظمتِ گم گشتہ کی تجدید ہے!

عہدِ طفلی میں ملا ہے رتبۂ پیری تجھے

مل گئی معصومیت ہی میں جہانگیری تجھے!

ہو مبارک تجھ کو یہ اقبال مندی کے نشاں

ہاں مگر ہشیار ! اے ننھے سے میرِ کارواں

اور ہے تیرا زمانہ، تیری منزل اور ہے

اور ہے علمِ کتابی، دانشِ دل اور ہے

اپنے زور و زعم سے پرواز کرنا ہے تجھے

یعنی ہر منزل پہ منزل سے گزرنا ہے تجھے

عارفانہ ذوق سے پیدا دلِ بیدار کر

گرد آلودہ نہ ہو جائیں کہیں قلب و نظر!

جاہ و دولت کی ضرورت ہے امیروں کے لئے

ہے حیاتِ جاوداں روشن ضمیروں کے لئے

جادۂ منزل کا تو اک منتخب سالار ہے

تیرا سرمایہ فقط قرآن اور تلوار ہے!

تھام لے معصوم ہاتھوں میں عنانِ رہبری

سطوتِ شبیرؑ جاں ہو، تن ہو فقرِ حیدریؑ

تیرے مستقبل میں پنہاں ہے حیاتِ سرمدی!

ہے سنِ مسند نشینی! "مرشدِ برحق تقی"! ۱۹۴۶ء

۱۳۶۴ ہجری

بلبلِ ہند

(شریمتی سروجنی نائیڈو کی ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر)

مادرِ ہند کی ہیں جاں، جادو بیاں سروجنی!
بزمِ سیاسیات کی روحِ رواں سروجنی!

نازشِ طبقۂ اناث، قابلِ قدر و احترام
کُل ہند کی زباں پہ ہے، دیوی سروجنی کا نام!

ہردل عزیز، نیک دل، شیریں کلام، ذی وقار
سوزِ تمام کے نشاں، جن کی جبیں سے آشکار

فیاض و مستقل مزاج، حسّاس اور درد مند
انسانیت کا شاہکار، جن کا تخیلِ بلند!

ہندوستاں کی ترجماں، بلبلِ ہند کی زباں!

ہے جن کی ساری زندگی، حبِ وطن کی داستاں!

جن کا جلالِ شاعری، تاباں مثالِ آفتاب

جن کے تخیلات کی، ضرب المثل ہے آب و تاب

کاخِ ادب میں جب ہوا، تاباں طلائی آستاں

مشرق میں جذب ہوگئیں، مغرب کی تابناکیاں!

برق نما چمک اٹھی، طائرِ وقت کی نظر

صحنِ چمن میں چھوڑ کر، کون گیا شکستہ پر!

سوزِ حیاتِ قلب سے، گرم نوائے آرزو

ہے رگِ ساز میں رواں، صاحبِ ساز کا لہو!

ہندوستاں کو ناز ہے، فخرِ دکن کی ذات پر

اہلِ فرنگ دنگ ہیں، مشرق کی کائنات پر!

آئے الٰہی بار بار، یوں ہی پیامِ جوبلی
عیدِ سلامتی رچے، یوں ہی بنامِ جوبلی!

مانندِ خضرِ جاوداں، سلسلۂ حیات ہو!
مسعود و سازگار یہ، جشنِ جواہرات ہو!
۱۹۴۶ء

فتراک[1] دیکھ کر

افکارِ نو میں تاباں، اندازِ محرمانہ
اسلوبِ "جیم نقوی" ہے سازِ جاودانہ

بیساختہ تاثر، بیتاب سی نگاہیں
جیسے سکوتِ گل سے پیدا ہوں سرد آہیں!

تصنیفِ تازہ یعنی فتراک سامنے ہے
گویا کسی کا قلبِ صد چاک سامنے ہے

حسنِ نظر سفینہ فطرت کا کھے رہا ہے
دل واردات دل کی تصویر لے رہا ہے!

بیتابیٔ مسلسل، مصروفِ جستجو ہے
فکر و نظر کی دنیا سرگرمِ آرزو ہے

سوزِ حیات، دل کا مطلوب بن گیا ہے
فطرت کا ذوقِ شعری اسلوب بن گیا ہے!

اعجاز کاریاں ہیں، یا دل کی داستاں ہے!
محسوس ہو رہا ہے جذبات کی زباں ہے!

سنہ ۱۹۴۵ء

[1] محترمہ جہاں بانو بیگم نقوی کے مضامین کا مجموعہ۔

جامعۂ ازہر

تابندہ یادگار ہے یہ مصر و شام کی
جس کی زباں، زباں ہے خدا کے کلام کی!
معمور دل ہے تاب و تبِ احترام سے
روحانی اُنس ہے مجھے ازہر کے نام سے!

۱۹۴۶ء

یادگار

بہن سکینہ بیگم سے پھول کا تحفہ ملنے پر

(یہ تحفہ "حضور یزداں" کے آخری بند سے متاثر ہو کر دیا گیا تھا)

اے گُلِ رنگیں! ہے تجھ میں جذبِ قلبی انتشار
ہے تمنائے برومندی کا تو آئینہ دار
ٹوٹ کر شاخِ شجر سے تحفۂ رنگیں بنا
اضطرابی کیفیت میں موجبِ تسکیں بنا
باہمی اخلاص کے جذبات سے آباد ہے!
تجھ میں پنہاں ایک رنگیں حادثے کی یاد ہے!

حدیثِ دکن

ہمارا نظامِ شریعت

نہ پوچھ! اسکی حقیقت کہ آج کیا ہے دکن!
وقارِ ہند کا باعث بنا ہوا ہے دکن!

کسے نصیب یہ عزّت، یہ شانِ خودداری
نظر میں ہر کہ و مہ کی کھبا ہوا ہے دکن

وہ کوہِ نور، وہ ہیرے نہ ہوں بھی تو کیا غم
جواہراتِ ادب سے بھرا ہوا ہے دکن!

کیا ہے غیر ممالک سے بے نیاز ہمیں
وہ گیان مان کی گنگا بہا رہا ہے دکن

معاشرت میں، تمدن میں، اور ہر اک فن میں
ترقیوں کے منازل پہ آ گیا ہے دکن

یہاں عروج ہے، دولت ہے، امن حاصل ہے
شہنشہانِ سلف کی دلی دُعا ہے دکن!

یہ فیض ہے شہ عثماں، کی حکمرانی کا
کہ یادِ عظمتِ رفتہ دلا رہا ہے دکن

مسلّمہ ہیں معارف نوازیاں اس کی
کہ سایہ گسترِ عالم، فلک نما ہے دکن

صفت ہے خاص مساوات اور رواداری
اسی نظامِ شریعت پہ چل رہا ہے دکن

ہے فیضِ عام بلا قیدِ مذہب و ملّت
عدو کی آنکھ کا تارا بنا ہوا ہے دکن

جو "شانتی" ہے یہاں ہند میں نہیں ہے کہیں
کہ ظلِّ آصفِ سابع میں پل رہا ہے دکن

رہے الٰہی سلامت دکن کا یہ والی
فروغ جس کی اعانت سے پا رہا ہے دکن

بشیرؔ مجھ کو ہے پیارا، وطن کا ہر ذرّہ!
کہ میرے ہر رگ و پے میں بسا ہوا ہے دکن! سنہ ۱۹۳۹ء

دکن کے فن کار سے

بن ابرِ فیض اور زمانے پہ چھائے جا — شاداب قلب و جاں ہو وہ دولت لٹائے جا
اردو کی پیشِ رفت کا مژدہ سنائے جا — اردو نواز! اردو کو آگے بڑھائے جا

صدیوں سے تذکرہ تری روشن دلی کا ہے!
سب مانتے ہیں یہ کہ تو وارث ولیؔ کا ہے!

تیری نوا سے شعلۂ غم میں سکون ہے — نیرنگیِ حیات میں تیرا جنون ہے
تیری نگاہ، زخمۂ سازِ فنون ہے — تاریخ کی رگوں میں رواں تیرا خون ہے

اس دورِ کشمکش میں عجب تیری شان ہے
باقی تجھی سے عظمتِ ہندوستان ہے

زندہ ہے زندگی تری سوز و گداز سے   وابستہ تیرا لحن ہے فطرت کے ساز سے
سینوں کو جگمگا دے، نوا ہائے راز سے   گرما دے بزم کو سخنِ دل نواز سے

"رہنے دے جستجو میں خیالِ بلند کو!
حیرت میں چھوڑ! دیدۂ حکمت پسند کو!"

تیری زباں میں گر تب و تابِ بیاں نہیں   تیرے تخیلات جو گوہر فشاں نہیں
تو بھی نہیں، ادب بھی نہیں اور زباں نہیں   پھر اس سے بڑھ کے قوم کا کوئی زیاں نہیں

جب یہ نہیں تو شعر سے رشتہ ہی توڑ دے
پہلو میں دل نہیں تو تڑپنا بھی چھوڑ دے!   ۱۹۴۳ء

اردو کی راج دھانی

پھولوں کے رنگ روپ سے زینت چمن کی ہے
تاباں دُرِ خوش آب سے قسمت عدن کی ہے
ہندوستاں میں آج جو عظمت دکن کی ہے
عزّت وہی ہے اپنی جو اپنے وطن کی ہے
خوش ہوں کہ اس زمین پہ میں نے جنم لیا!
قدرت نے جس کو علم و امارت سے بھر دیا!
علم و عمل کا راج ہے، دائم بہار ہے
آسودہ حال شہری ہیں، خوش شہر یار ہے

اپنی نظیر آپ، یہ اپنا دیار ہے
مالک! ترے کرم سے دکن کا وقار ہے

کیوں ناز ہو نہ ملک کو اس تاجدار پر!
بدنظمیوں کا دور ہیں جس کے نہیں گزر!

ذہنی تباہیوں سے دکن ہے بچا ہوا
اللہ کی رحمتوں سے ہے گویا بھرا ہوا

حاجت روائیوں سے دلوں میں کھُبا ہوا
کُل ہند کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا

امن و اماں کے نور سے معمور ہے دکن!
اور کج ادائیوں سے بہت دُور ہے دکن!

اہلِ دکن کو شاہ پرستی سے کام ہے
والی یہاں کا، ظلِّ الٰہ لاکلام ہے

یکتائے روزگار یہاں کا نظام ہے

پرچم پہ حکمرانی کے اللہ کا نام ہے

آزادیوں میں یاں ہے مذاہب کی پرورش!

تسخیرِ رُوح و قلب ہے اس خاک کی کشش!

اس سرزمیں نے کھولے ہیں عقدے قلوب کے

رشتے ملا دیئے ہیں شمال و جنوب کے

سارے نقوش و خدشے مٹے ہیں عیوب کے

اُردو یہیں سے اُبھری ہے اک بار ڈوب کے

اس دورِ کش مکش میں یہاں اطمینان ہے!

باقی دکن سے عظمتِ ہندوستان ہے!

ہر دم ریاضِ اردو پہ ہے یاں نئی بہار

شاہِ دکن کا فیضِ ہمایوں ہے آبیار

اس دور میں ہوا یہ زمانے پہ آشکار
اُردو زباں کا آصفِ سابع ہے تاجدار

اُردو کو ناز جامعۂ عثمانیہ پہ ہے!
اور جامعہ کو رافتِ سلطانیہ پہ ہے! ۱۹۴۳ء

اپنی زبان

قائم تغیرات پہ ہستی کا ہے نظام
اک سیلِ انقلاب ہے دنیا ہے جس کا نام

ہر لحظہ اضطراب پہ مائل ہے زندگی
یعنی کہ پیچ و تاب کی قائل ہے زندگی

پستی کا امتیاز بھی رفعت کے ساتھ ہے
اور شورشِ وجود، عدم ہی کے ہاتھ ہے

لیکن ہے فتحمندی کا طاقت پہ انحصار!
طاقت کا اتفاق و محبت پہ ہے مدار!

پہلے زمین و زر پہ جھگڑتے تھے فتنہ گر
اس دور میں ہے اک نیا جھگڑا "زبان" پر

ہم خانہ جنگیوں میں گرفتار ہو گئے
اغیار کی بن آئی کہ سرکار ہو گئے

بیزار اپنی وضعِ تمدن سے ہم رہے
ہر اک طرح سے تختۂ مشقِ ستم رہے

یہ جنگ اور تباہی کے آثار الاماں — یہ آتشیں فضاؤں کے اشرار الاماں

ہیں اب تو مال و جان کے لالے پڑے ہوئے — غارت گرِ سکون ہیں در پر کھڑے ہوئے

اقبال اور عروج و امارت بھی کھو چکے — اگلی وہ آن بان وہ عظمت بھی کھو چکے

وہ امن کا سہانا زمانہ گزر گیا — شیرازہ اتفاق کا یکسر بکھر گیا

بے لاگ زندگی کا سکوں خواب بن گیا — پانی کا اب تو قطرہ بھی گرداب بن گیا

پر یہ جمود و شامتِ گلزار تابہ کے؟

خوابِ گراں پہ خندۂ اغیار تابہ کے؟

لے دے کے اک زبان پہ قابو نصیب ہے — کچھ دوڑ دھوپ کیجیے کہ خطرہ قریب ہے

الفت اگر ہے آپ کو ہندوستان سے — غافل نہ آپ ہوں کبھی اُردو زبان سے!

اس دورِ کش مکش میں ہوئی نیم جان ہے

للہ! سنبھالیے کہ یہ "اپنی زبان" ہے!

۱۹۴۲ء

اُردو کی لاج

(ادارۂ ادبیات اُردو شعبۂ نسواں کے اجلاس عام کے موقع پر)

زہے نصیب! ہمارا یہ شعبۂ نسواں
ادارۂ ادبیات کا ہے روحِ رواں

ترقیوں پہ ہیں کیا کیا ترقیاں اس کی
سنائی جاتی ہے ہر سمت داستاں اسکی

ہے اس کے پھولوں سے تزئینِ گلستانِ ادب
اور اس کے تاروں سے روشن ہے آسمانِ ادب

کیا وہ کام ہے چھوٹی سی عمر میں اس نے
معمّروں کو بھی شرمندہ کر دیا جس نے

کئی کتابوں سے دنیا کو روشناس کیا
زبانِ اردو کو اس نے نکو اساس کیا

ہے آج چوتھی نومبر کو اس کی سالگرہ
خدا کرے کہ ہو ہر سال! یونہی سالگرہ

بنیں دکن کے زن و مرد ادب کے حلقہ بگوش
"ادارۂ ادبیات" کے ہوں دوش بدوش

بلادِ ہند میں اردو کا بول بالا ہو　　دکن کی شمع سے "چار اُور" پھر اُجالا ہو

" شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجا مری یارب قبول ہو جائے "

دھڑکتے دل سے حقیقت بھی کچھ بیاں کر دوں　　دبی زبان سے کچھ شکوۂ زباں کر دوں

عیاں ہے سب پہ جو حالت ہے آج اردو کی　　پہ اب ادیبوں کے ہاتھوں ہے لاج اردو کی

برائے اُردو ہے درکار آپ کا احساں　　کہ اتحاد سے ہوتی ہیں مشکلیں آساں

زبان ایک کرشمہ ہے زندگانی کا　　ادب وسیلہ ہے فطرت کی ترجمانی کا

زباں کی قدر میں خود اپنی قدر دانی ہے　　زباں کے رشتے سے مربوط زندگانی ہے

جو اس کا آپ کو اندیشۂ زیاں نہ رہے　　تو آپ کی یہ زباں، آپ کی زباں نہ رہے

زباں نہ ہو تو ادب کا کوئی وقار نہیں　　ادب نہ ہو تو زباں کا کہیں شمار نہیں

صعوبتوں سے مگر تنگ دل نہ ہوں رہرو　　" کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو "

مجھے یقین ہے جب تک ہے یہ دکن باقی
جیے گی اُردو کہ اردو کا ہے وطن باقی!　　۱۹۴۰ء

"نذرِ دکن"

روز افزوں ہے، ترقی پہ دکن کا معیار
چشمِ بد دور! کہ بے مثل ہے آج اپنا دیار

ہو مبارک یہ نیا دور، نئے لیل و نہار
ہوگئیں اب تو خواتینِ دکن بھی بیدار

دورِ عثمانی میں، گلزارِ ادب ہے ایسا
روز آتی ہے جہاں، نت نئی اک تازہ بہار

ہو چکا ہے ادبی شعبۂ نسواں قائم
جس کا مقصد ہے کہ بن جائے ہر اک گل گلزار

تھا عقیدت کا تقاضا کہ کریں نذرِ دکن
پیشکش ایسا کہ ہو عقدِ ثریا بھی نثار

فکر سرگرمِ تجسس رہی، مثلِ غواص
للہ الحمد کہ ہاتھ آگیا دُرِ شہوار

سعی مشکور ہوئی، ایک مجلّہ نکلا
جس میں ہیں صرف خواتین ہی مضمون نگار

زیبِ قرطاس ہوئے ایسے مضامینِ لطیف　　　جیسے بے لوث تخیّل ہیں، نسائی کردار
للّٰہ الحمد، ہر آں چیز کہ می خواست بشیر
جلوہ گر شد زپسِ پردہ، بہ حُسنِ تدبیر　　　۱۹۳۹ء

غنچۂ نورس

آسودہ اسی طرح رعایا ہے دکن میں
جس طرح چہکتے ہیں طیور اپنے چمن میں

ہر سمت ہیں تنظیمِ خوش آئند کے چرچے
دن دونی ترقی ہے ہر اک شعبۂ فن میں

اے اہلِ دکن، لاکھ بدل جائیں فضائیں
ہشیار! نہ فرق آئے روایاتِ کہن میں

لائی ہیں خواتینِ دکن بہرِ دکن آج
اک غنچۂ نورس کھلا "سب رس" کے چمن میں

کوزے میں سمندر کا سمانا تو سنا تھا
"سب رس" کی مہک دیکھیے اب "نذرِ دکن" میں

۱۹۳۹ء

شعبۂ نسواں

(ادارۂ ادبیاتِ اردو شعبۂ نسواں کے افتتاحی اجلاس کے موقع پر)

خوشا قسمت نویدِ جانفزا بادِ صبا لائی
گلستانِ ادب میں اور اک تازہ بہار آئی

تعالیٰ اللہ کیا اعجازِ دورِ شاہِ عثماں ہے
کہ اس عہدِ مبارک میں ہر اک گھر اک دبستاں ہے

مبارک اے دکن! اہلِ دکن برکاتِ عثمانی
مبارک ہو خواتینِ دکن، معراجِ نسوانی

خدا کا شکر ہے قائم ہوا ہے شعبۂ نسواں
وہ جس کا مدتوں سے منتظر تھا طبقۂ نسواں

فریضہ اپنا اب یہ ہے کہ دیں ایسا فروغ اس کو

حیاتِ جاوداں پا جائے، دنیا مان لے جس کو

بہر صورت سدا جاری رکھیں کوشش ترقی کی

اب اپنے ہاتھ میں ہے لاج اسکی اور اپنی بھی

یہ بزمِ نو، ہو ثابت کار آمد کامراں ہو کر

پھلے پھولے یہ شاخِ گل جہاں میں گلستاں ہو کر

مرادیں بانیٔ شعبہ کی یارب ساری بر آئیں

خواتینِ دکن بامِ ترقی پر نظر آئیں

اگرچہ عام ہیں تعلیم کے چرچے زمانے میں

تاسف ہے مجھے لیکن حقیقت کے سنانے میں

بہت پیچھے ہیں اب تک ہم گزشتہ کاروانوں سے

ہے لغزش ہر قدم پر اور شکایت آسمانوں سے

مہیا ہیں اگرچہ ملک میں ساماں ترقی کے
ترقی ہو گی جب حاصل کہ ہوں خواہاں ترقی کے

ہماری فطرتوں میں ہیں ابھی کمزوریاں باقی
کہ اب تک ہم میں دانستہ بھی ہیں نادانیاں باقی

نحیف و زار فطرت ہے، طبیعت لاابالی ہے
ہماری اپنی دنیا بس خیالی ہی خیالی ہے

اگر بے کیف رکھتی ہیں فضائیں گلستانوں کی
تو ہو ذوقِ نظر کی! یا شکایت باغبانوں کی؟

کبھی تقدیر کے شکوے، کبھی قسمت پہ روتے ہیں
ہم اپنے وقت کی دولت کو بس اس طرح کھوتے ہیں

مبارک ہے وجود ان کا جو خطروں سے گزرتے ہیں
تذبذب میں جو رہتے ہیں سدا ناکام مرتے ہیں

حقیقت میں وہی انساں ہیں جو کچھ کام کرتے ہیں

سر اپنا دے کے اپنی سرزمیں کا نام کرتے ہیں

یوں ہی گر بے عمل بیٹھے رہیں ہم آشیانوں میں

"ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں!" ۱۹۳۹ء

تاسیسِ مدرسۂ بالغات

نظر آتی ہیں تاثیریں نصیبِ زور آور کی
کہ جاری چشمۂ شیریں ہوئے دشت و بیاباں میں

خبر آئی کہ اب سرسبز ہوں گے پھر نئے سر سے
وہ اشجارِ خزاں دیدہ جو ہیں گلزارِ نسواں میں

بڑی مصروف ہے آرائش و تنظیم میں دنیا
سفیدی ہو رہی ہے اب پرانے کاخ و ایواں میں

کسے معلوم تھا سوئی ہوئی تقدیر جاگے گی
خبر کیا تھی کہ آئے گی بہار اُجڑے گلستاں میں

مقدر میں سعادت ہو تو یوں اسباب بنتے ہیں
اسیروں کو نہ رہنا چاہئیے مایوس زنداں میں

خدا رکھے وہ اب کچھ زندگی کا لطف پائیں گے
کٹی ہے جن کی ساری عمر ماحولِ پریشاں میں

اُڑیں گے اب فضاؤں میں طیورِ پرشکستہ بھی
کہاں تاثیر تھی اتنی بھلا تختِ سلیماں میں

یہ اقدامِ عمل اے بانئ شعبہ مبارک ہو
خدا جوشِ عمل دے "شعبۂ نسواں" کے ارکاں میں

"یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے!"

۱۹۳۹ء

خانوادۂ آصفی

عیدِ سیمیں

(بہ تقریب جشن سیمین آصف سابع شہریارِ دکن و برار)

ہواخواہانِ دولت نے ارادت کا ثمر پایا
بہار آئی، سنہری رُخ پہ پھولوں کے نکھار آیا

زبرجد سے مزین تختہ ہائے مرغزاراں ہیں
کہیں قمری کے نغمے ہیں، کہیں طاؤس رقصاں ہیں

سپیدی چھا رہی ہے لاجوردی آسمانوں پر
چلی ہیں رات کی تاریکیاں، انجم کے شانوں پر

طیورِ خوشنوا، شاخِ شجر پر چہچہاتے ہیں
تبسم ریز ہیں غنچے، گُلِ تر کِھل کِھلاتے ہیں

کدورت دل سے دھوتی ہیں یہ موجیں جوئباروں کی
طیورِ صبح کی تانیں، صدائیں آبشاروں کی
گیاہِ سبز پر، بکھرے ہوئے شبنم کے موتی ہیں
عروسانِ بہاری، صبح دم گجرے پروتی ہیں
عجب پُر کیف عالم ہے عجب دلچسپ منظر ہے
مسرّت بانٹنے میں، منہمک قدرت سراسر ہے
لئے طشتِ زمرّد میں انوکھے پھول چاندی کے
کھڑی ہیں منتظر پریاں صفیں باندھے ہوئے صف سے
افق کی زرد یاں، اب صبح کا پیغام لاتی ہیں
فضائیں نور سے معمور، کچھ کچھ ہوتی جاتی ہیں
ہٹا کر رُخ سے وہ زرّیں نقاب آہستہ آہستہ
برآمد ہو رہا ہے آفتاب آہستہ آہستہ

شفق پھولی، کرن چمکی، نویدِ خوشگوار آئی
دکن میں پہلی ذی الحجہ کی صبحِ زرنگار آئی

وہ صبحِ رُوح پرور، وہ تمنا جاں نثاروں کی
کہ جس کے دیکھنے کو، ساری خلقت چشم بر رہ تھی

خرامِ ناز سے آئی، بہ شانِ دلبری آئی
عروسِ صبح بن کر، آج سلور جوبلی آئی

فضائیں گونج اُٹھیں، کامیابی کے ترانوں سے!
مسرّت کی دھنیں برپا ہوئیں نقارخانوں سے!

مبارک باد کے نغمے ہیں پیدا، سازِ عالم سے
فسانے ہیں مسرت کے ترانے ہیں سلامی کے

بحمداللہ! کیسی شُبھ گھڑی کے نامہ بر آئے
وہ دیکھو "پیلے پیلے" پرچمِ اقبال لہرائے!

طلائی جوبلی کا پیش خیمہ جشنِ سیمیں ہے

روپہلے آئینے میں ضوفگن تعبیرِ زرّیں ہے

کہیں جشنِ طرب افزا، کہیں بزمِ سخنداں ہے

کوئی سرگرمِ نغمہ ہے، کوئی محوِ خیاباں ہے

دکن کی سرزمیں ہے، رشکِ گردوں چراغاں سے

بنی ہے گلستانِ نور، بجلی کی بہاراں سے

نشاط انگیز دنیا کے لئے یہ جشنِ سیمیں ہے

کتابِ مملکت کا بست و پنجم باب "زرّیں" ہے

تعالی اللہ! ایں عہدِ شبابِ سلطنت آمد!

بہارِ فتحمندی، در ریاضِ مملکت آمد!

یہ اُس کا جشنِ سیمیں ہے، جو ہے سلطانِ سیاست کا

یہ ہے تقریب اُس کی، جو شہنشہ ہے فصاحت کا

جری ایسا کہ اتراتی ہے جرأت دیکھ کر جس کو
فریس ایسا کہ جس سے فخر ہوتا ہے فراست کو

مرے شاہِ دکن! روحِ دکن، جانِ دکن تو ہے
دکن کی شان ہے تجھ سے شہا! شانِ دکن تو ہے

ہے زینت تخت کو، تیرے قدومِ میمنت فرسے
شرف ہے تاج کو، تیرے وجودِ دادگستر سے

غریبوں کی اماں تو ہے، پناہِ بیکساں تو ہے
نگہباں امن کا، انسانیت کا پاسباں تو ہے

تہی دستانِ قسمت، عزّت و اقبال سب کھو کر
مسلماں جی رہے ہیں آج تیری ہی توقع پر

حکومت جاں کرہی کی عطا، خلّاقِ فطرت نے!
ہزاروں قسمتوں پر، تجھ کو قدرت دی ہے قدرت نے!

ہے محسودِ خلائق، اب دکن تیرے زمانے میں

بنا ہے سرزمینِ علم و فن، تیرے زمانے میں

نئے ابواب تو نے صنعت و حرفت کے کھولے ہیں

رعایا پر خزانے علم کے، حکمت کے کھولے ہیں

کہیں آرائشِ بلدہ کہیں تعمیر کاری ہے

فلاحِ ملک کی اب چارسو اسکیم جاری ہے

کھلا ہے دادخواہوں کے لئے ہر وقت در تیرا

ہر اک سر میں ترا سودا، ہر اک دل میں ہے گھر تیرا

تر و تازہ ادب کا راج میں تیرے گلستاں ہے

ہر اک بستی، ہر اک کوچہ، ہر اک گھر اک دبستاں ہے

بنا کر "جامعہ" تو نے کیا ہے علم کو "ملکی"

نہیں حاجت رہی باقی "سمندر پار" جانے کی

رہینِ منتِ رافت نہیں ہے اک دکن تیرا
کہ ہے ضرب المثل دنیا میں، مہر آگیں چلن تیرا

الٰہی گردشِ شمس و قمر ہے دہر میں جب تک
ستارے آسمانوں پر، روانی بحر میں جب تک

یہی تنظیم ہو، یہ ملک ہو، اور یہ ریاست ہو
شہِ ذیجاہ میر عثمان علی خاں کی حکومت ہو

خدایا رہتی دنیا تک رہے یہ عہدِ عثمانی!
رہے قائم ہوا خواہوں کے سر پر ظلِّ سبحانی! سنہ ۱۹۳۷ء

رافتِ سلطانی

گلزارِ آصفی میں انوکھی بہار ہے
اک ایک پھول اپنی جگہ "شاہکار" ہے
یہ سال یہ مہینہ یہ دن یادگار ہے
کیا سازگار گردشِ لیل و نہار ہے
آٹھوں پہر، سرورِ مسرّت، دلوں میں ہے!
اِک کیفِ انبساط، بھری محفلوں میں ہے!
مسرور حکمراں ہے رعایا بھی شاد ہے
بے مثل جشنِ سلطنت بامراد ہے

یوں تو دکن کا نام "عروس البلاد" ہے

لیکن کچھ آج اور ہی بست وکشاد ہے

ہر دلعزیز شاہ کی آئی ہے جو بلی!

کُل عالمِ بسیط پہ چھائی ہے جو بلی!

عالم پناہی شان کی مظہر ہے جو بلی

ارزانیٔ نشاط ہے گھر گھر ہے جو بلی

اہلِ دکن کو عید سے بڑھ کر ہے جو بلی

یا یوں کہو کہ بس حجِ اکبر ہے جو بلی

ہے جو بلی یہ کس کی؟ شہِ ذی وقار کی!

اسلامی سلطنت کے بڑے تاجدار کی!

یہ شہ کا جشنِ سیمیں، عجب خوشگوار ہے

ہر دل عزیز شہ پہ رعایا نثار ہے

ممنون ہر بشر ترا، اے تاجدار ہے
یہ طبقۂ اناث بھی منّت گزار ہے

ہم پر ہوئی ہے خاص توجہ حضور کی!
سرکار نے ہماری فلاکت ہے دُور کی!

علم و خرد سے عاری ہمارا کلام تھا
تعلیم کا خیال، نہ کچھ انتظام تھا
محکوم سب کے ہم تھے، یہی اپنا کام تھا
اور "ناقصات العقل" ہمارا ہی نام تھا

ہم سب کے سر کے بوجھ تھے، دنیا پہ بار تھے!
خود اپنی ہی نظر میں ذلیل اور خوار تھے!

کیا کیجئے بیاں کہ عجب حالِ زار تھا
رحم و کرم پہ اوروں کے بس انحصار تھا

مہمان جانا آنا بھی جب، ناگوار تھا
مرضی کوئی ہماری، نہ کچھ اختیار تھا
تھا کس کا دل جو سیر و سیاحت کا نام لے!
کس کی مجال تھی جو ولایت کا نام لے!
یہ ملک تھا، زمیں بھی یہی، تھی یہی فضا
دلچسپیوں کے، سیر کے ساماں تھے جا بجا
اسکول بھی، دفاتر و گلشن بھی جانفزا
پر کچھ نہ تھا ہمارے لئے قید کے سوا
"لائی حیات آئے قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے"
پچیس سال پہلے ہمارا یہ حال تھا
اُستانیوں کا ملک میں گویا کہ کال تھا

صحت کا اور فلاح کا کس کو خیال تھا
جلنے پہ اپنے آپ ہی ہم کو ملال تھا
لیکن خدا کا شکر ہے حالت بدل گئی
منجدھار میں جو ناؤ تھی بچ کر نکل گئی
تختِ دکن پہ شاہ جو نہی جلوہ گر ہوئے
تنظیم و انتظام کے احکام سر ہوئے
اگلے جو نظریے تھے وہ زیر و زبر ہوئے
نازل فیوض طبقۂ مظلوم پر ہوئے
قائم کئے مدارسِ لنسواں نئے نئے
پیدا ہوئے فلاح کے ساماں نئے نئے
حاصل ہوئیں ہمیں شہِ عثماں کی برکتیں
ہونے لگیں، پھر اس تنِ بے جاں میں حرکتیں

اس دستِ فیض کی ہیں یہ ساری کرامتیں
جس کے کرم نے کی ہیں مہیّا سہولتیں
اس شاہِ ذی حشم کی توجہ نے خاص کر!
احساں کئے ہیں طبقۂ نسواں کے حال پر!
اس کے کرم سے قابل و خود دار ہم بھی ہیں
ہر شعبۂ حیات میں، ہم کار ہم بھی ہیں
اعلیٰ ترقیوں کے طلب گار ہم بھی ہیں
آزادئ حیات کے حق دار ہم بھی ہیں
اس عہدِ کامگار میں حالت سنبھل گئی!
فی الواقعی ہماری تو دنیا بدل گئی!
علم و ادب سے آج ہر اک گھر ہے بوستاں
فنّی، تمدنی، ہوئیں حاصل ترقیاں

یہ اک کرشمۂ شہِ عثماں ہے اب یہاں
لڑکوں کی طرح پاتی ہیں اسناد لڑکیاں
بنیاد عہدِ شہ میں ہوئی، گرل گائیڈ کی
اس دور میں زنانہ کلب کی بنا ہوئی
قائم ہوئیں ہیں انجمنیں اور بھی یہاں
جلسے کہیں ہیں اور کہیں بزمِ سخنوراں
محرومِ علم اب نہ تو لڑکے، نہ لڑکیاں
گھر گھر سے اب ترقیٔ تعلیم ہے عیاں
ممنون و مطمئن نظر آتے ہیں آج ہم
سرکار کے طفیل سے کرتے ہیں راج ہم
لا شئے سہی، مگر جرسِ کارواں ہوں میں
اک طبقۂ نحیف کی گویا زباں ہوں میں

شکر و سپاس و عجز کی اک داستاں ہوں میں
منت گزارِ بارگہِ عز و شاں ہوں میں
بابِ اثر سے عرض کا مقصد حصول ہو!
یہ التجا بشیر کی یا رب قبول ہو!
جب تک سحابِ چرخ سے بارش ہوا کرے
جب تک کہ ماہ و مہر میں گردش رہا کرے
جب تک ہوا سے ہر متنفس جیا کرے
اس وقت تک رہے یہ حکومت خدا کرے
جاوید و ضو فشاں شہِ عثماں کا نام ہو!
دل فتحمندیوں سے سدا شادکام ہو!
آباد یا خدا رہے دربارِ آصفی
ہو سربلند طالعِ بیدارِ آصفی

بالا ستائشوں سے ہو معیارِ آصفی
پھولا پھلا سدا رہے گلزارِ آصفی
یہ نظم اور نظام، یہی طرز و طور ہو!
یہ مملکت ہو آصفِ سابع کا دور ہو! ۱۹۳۰ء

سالگرہ ہمایونی

خرامِ ناز سے بادِ بہار آئی ہے
شگفتگی کا گلوں کی پیام لائی ہے
طیورِ شاخِ شجر پر جو چہچہاتے ہیں
گلِ شگفتہ مسرّت سے پھول جاتے ہیں
گلِ نشاط کھلے گلشنِ مسرّت میں
ہیں انبساط کے فانوس بزمِ عشرت میں
چٹک کے غنچۂ تر تالیاں بجاتے ہیں
یہ خوش خبر لبِ گلبانگ سے سناتے ہیں

ہے آج آصفِ سابع کا جشنِ سالگرہ!
ہزار سال پڑے یونہی ذوالجلال گرہ!

رجب میں سالگرہ کی جو یہ نوید آئی
مہِ صیام سے دو ماہ پہلے عید آئی!

وہ شاہ! جس کی طبیعت میں بردباری ہے
وہ سیر چشم! ادا جس کی انکساری ہے

حضورِ نیک سیر! شہر یارِ پاک ضمیر
گرہ کشائے خلائق، بہ خلقِ عالمگیر

شہنشہانِ سلف اور شاہِ عثماں میں
وہ فرق ہے جو ہے انجیل اور قرآں میں

وہ سادگی! کہ تصدق ہوں جس پہ اہلِ نظر
وہ کج کلاہی! کہ دنیا کو ناز ہو جس پر!

عطا ہوئی ہیں سمجھ کر ہی قدریں تجھ کو!
خدا نے سونپ دیں ہم سب کی قسمتیں تجھ کو!

دلیلِ رحمتِ پروردگار تیرا کرم
نگاہِ قہر سے تیرے ہوا اک جہاں برہم

تو ابرِ رحمتِ حق اور سایۂ حق ہے
کہ تیری ذات سے گلزارِ دیں کو رونق ہے

ہر اک غریب کے دل سے دعا نکلتی ہے
اثر کے واسطے اللہ سے مچلتی ہے

یہی وہ در ہے کہ قسمت جہاں بدلتی ہے
بغیر پھولے تمنا کی شاخ پھلتی ہے

کہاں یہ اوروں میں اعجاز حکمرانی کے!
کسے نصیب یہ انداز کامرانی کے!

زبانِ خامہ کہاں وصفِ بے حساب کہاں
حقیر ذرّہ کہاں اور آفتاب کہاں
بیانِ وصف میں خالی ہے فکر کی آغوش
ہزار گونہ سخن در دہان ولب خاموش
سزد کہ ناز کند ہند بر دیارِ دکن!
کہ شہریارِ قلوب است تاجدارِ دکن!
جہاں میں طلعتِ شمس و قمر رہے جب تک
زمیں پہ سکۂ شام و سحر رہے جب تک
اُمورِ شہ میں نہ ہرگز گرہ کا نام پڑے
مگر یہ سالگرہ کی گرہ، مدام پڑے!
یہ بزمِ عیش ترے گھر میں روزافزوں ہو
برنگِ سالگرہ ہر گرہ ہمایوں ہو!

شریکِ حال ترے فضلِ کردگار رہے
ہمیشہ گلشنِ اُمید میں بہار رہے
مئے نشاط سے لبریز تیرا جام رہے!
جہاں میں زندۂ جاوید تیرا نام رہے! سنہ ۱۹۳۱ء

قِرانِ السعدین

اے ولیعہدِ دکن! فرزندِ شاہِ نامدار
ہو مبارک، آپ کو اپنا وطن! اپنا دیار!
دورِ عثمانی کے زریں کارناموں میں ضرور
آپ کا یورپ کو جانا بھی رہے گا یادگار
مسلمِ بے جاں کے تن میں آج جاں سی آگئی
ہو کے اب اپنی رہے گی گردشِ لیل و نہار
اے دُرِ تابندۂ عثمان علی خانِ دکن
آلِ عثماں کا مبارک تجھ کو "دُرِّ شاہوار"!

یہ نیا رشتہ درخشاں دور کی تمہید ہے!
عقدِ اعظم جاہ کا ملکِ دکن کی عید ہے!

اے معظم جاہ! بھائی کے شریک و ہم سفر
دودمانِ آصفی کے ایک تابندہ گہر
کامرانی سے ترا پُر دامنِ اُمید ہے
خوش نصیبی پر ترے حیران ہیں اہلِ نظر
دیکھ لی مغرب نے اب اہلِ دکن بھی دیکھ لیں
چنقلج خانی وجاہت، ترکمانی کرّوفر!
کرّوفر اُن کا ہے بخت اُن کا حکومت اُن کی ہے
جن کی قسمت میں ہیں دُرِّ شاہوار و نیلوفر!

آل اور اولادِ عثماں کا بنا مرکز دکن!
کیا عجب بدلے زمانہ اک نیا آواگون!

سنہ ۱۹۳۱ء

عیدِ نوروز

(شہزادۂ مکرم جاہ بہادر کی ولادت کے موقع پر)

ماہِ آذر میں ہیں نوروز کے ساماں پیدا

لو ہوا چرخِ دکن پر مہہ تاباں پیدا

للہ الحمد! دُرِ تاجِ خلافت سے ہوا

گوہرِ زینتِ تاجِ شہہ عثماں پیدا!

چاند مشرق کا ہوا چرخ پہ مغرب کے طلوع

مصر میں جیسے ہوا تھا مہہ کنعاں پیدا!

اے خوشا بخت کہ ہاتف نے دیا یہ مژدہ

ہو گیا چشم و چراغِ شہہ عثماں پیدا!

لو جگر بندِ جگر بندِ شہہ عثمان نے
ملک میں عیش و طرب کے کئے ساماں پیدا
دَورِ عثمانی کی برکات کی جیتی تصویر
دیکھ لو اب کہ ہوئے برکت علی خاں پیدا
ہو مبارک یہ ولی عہد ولی عہدِ دکن
مہرِ تاباں سے ہوا ہے مہہ تاباں پیدا
پھولتا پھلتا رہے آصفِ سابع کا چمن
اس کی ہر شاخِ تمنا سے ہوں بستاں پیدا
اے بشیرؔ عرض ہے خالق سے کہ بس یونہی سدا
بزم میں شاہ کی ہوں نت نئی خوشیاں پیدا
۱۹۳۳ء

کامراں مراجعت

(زمانۂ جنگ میں یورپ کے سفر سے واپسی کی مسرت میں)

بہارِ تازہ زِ مغرب بہ ایں دیار آمد
نبیرۂ شہہ عثمانِ کامگار آمد

مفخّمے کہ فخامت زروئے او پیداست
بہ بر گرفتہ جہاں دُرِ شاہوار آمد

زما پیام رساند کسے بہ شاہِ دکن!
برآرِ تازہ، بہ شہزادۂ برار آمد!

تعالیٰ اللہ! دعائیں اپنی یہ تاثیر لائی ہیں
بخیر و عافیت شہزادیاں یورپ سے آئی ہیں

نہ تھی تشویش تک بھی، جنگ و موجودہ تباہی کی
ہمیں تو فکر رہتی تھی فقط ارکانِ شاہی کی
مساجد، خانقاہوں، شاہراہوں اور مکانوں سے
نکلتی تھی دعائے واپسی لاکھوں زبانوں سے
مقامِ جنگ سے جب تار وحشت ناک آتے تھے
ستارے آسمانِ سلطنت کے جھلملاتے تھے
کسی اخبار میں گر "واپسی" عنواں نظر آتا
گماں فی الفور اپنا شاہزادوں کی طرف جاتا
کبھی جب نشرگہ سے تازہ کچھ اعلان ہوتا تھا
دلوں میں جاں نثاروں کے بپا طوفان ہوتا تھا
دعائیں مانگنے کو اجتماعِ عام ہوتا تھا
ہر اک فرطِ خضوع سے لرزہ براندام ہوتا تھا

نکلنے بھی نہ پاتی خاکِ سجدہ تک جبینوں سے
کہ اُٹھ کر پوچھتے تھے کیفیت اخبار بینوں سے
امید و بیم کی یہ کشمکش ہر دم ستاتی تھی
نہ دن کو چین ملتا تھا نہ شب کو نیند آتی تھی
سفینہ اپنی تقدیروں کا گردابِ بلا میں تھا
قبیلہ آصفِ سابع کا طوفانی فضا میں تھا
بفضلِ رحمتِ پروردگار، آخر وہ دن آیا
رعایائے دکن نے مژدۂ آمد بھی سُن پایا
خدا کا شکر ہے جاتی رہیں بے تابیاں اپنی
ہجومِ شوق سے لبریز ہے اب داستاں اپنی
ریاضِ آصفی میں شادمانی کے ثمر آئے!
بخیر و عافیت سرکار کے لختِ جگر آئے!

مکرّم، پویاں پویان و مفخّم در کنار آمد
دُرِ شہوار، با شہزادۂ ملکِ برار آمد
جلالِ ترکمانی از معظم جاہ پیدا شد!
فرِ نیلوفری بنگر برنگِ نو ہویدا شد!

۱۹۳۹ء

سانحۂ عظیم

(مادرِ دکن کی وفات پر)

ملکِ دکن پہ چھائیں گھٹا ٹوپ بدلیاں
رنج والم اُداس فضاؤں سے ہے عیاں
چہرے اُداس، خاک بسر اور چشم، تر
اہلِ دکن ملول و پریشاں ہیں سر بہ سر
دفتر، دکانیں، مدرسے بازار بند ہیں
مندا ہے کاروبار، سبھی فکرمند ہیں
اس سرزمیں پہ صبح سے جھاڑو نہیں ہوئی!
کنگھی کو فکرِ زینتِ گیسو نہیں ہوئی!

ماتم کدہ "پُرانی حویلی" ہے رات سے!
محشر بپا ہے اُمِّ دکن کی وفات سے!

بے چین و بے قرار و پریشان ہیں حضور!
فرطِ الم سے جسمِ معلّیٰ ہے چُور چُور!
دل ہل گئے، پُرانی حویلی کا در کھُلا
وابستگانِ ملک کا سیلاب اُمنڈ پڑا
کہرام مچ گیا کہ چلیں مادرِ دکن!
چمکے نصیب قبر کے، سونی ہے انجمن!
ہمراہئی جلوس ہیں گو فاصلہ ہے دُور
اللہ رے احترام! کہ پیدل چلے حضور!
ہر سمت تذکرے تھے یہی خاص و عام میں
کتنا وقار ماں کا ہے قلبِ نظام میں!

منظر وہ ہائے "مسجدِ جودی" کے سامنے!
سرکار آگئے آئے، سواری کو تھامنے!
مقبول بارگاہ میں ماں کی دعا ہوئی!
فرزند ہی سے آخری خدمت ادا ہوئی!

اس دور میں کہ حفظِ مراتب کا کال ہے
ماں باپ کے حقوق کا کس کو خیال ہے!
لیکن، حضورِ والا نے جو حق ادا کیا
دنیا کو درسِ خدمتِ مادر سکھا دیا!

فرزند! اور وہ بھی ریاست کا حکمراں
قلب و دماغ اُمورِ سیاست سے سرگراں
پھر بھی یہ ذوق و شوقِ اطاعت کا حال تھا!
بیمار ماں کا ہر گھڑی، ہر دم خیال تھا!

جس وقت سے کہ ماں کی طبیعت خراب تھی
کیا بے قرار ذاتِ جلالت مآب تھی
آرام تھا نہ نیند، نہ کچھ بھوک پیاس تھی
رہتے اُداس اُداس پہ صحت کی آس تھی
تبدیلئ مزاج پہ ہر لحظہ تھی نظر
تیمار داریوں میں رہے رات رات بھر
موجود جاں نثار اگرچہ ہزار تھے
لیکن دوا پلاتے تھے خود اپنے ہاتھ سے
رحمت خدا کی اس شہِ عالی مقام پر!
ماں نے دعائیں جس کے لئے کی ہوں عمر بھر!
اے خوش نصیب مادرِ شہ، مادرِ دکن!
کس کو نصیب ہے ترے مرنے کا بانکپن!

اے مہربان ماں تری شفقت کی یاد ہے
غمگین اور اُداس عروس البلاد ہے

چاروں طرف سے تعزیتی تار آئے ہیں
دلداریٔ حضور کا پیغام لائے ہیں

ماتم کی مجلسیں ہیں کہیں بزمِ تعزیت
سلطاں کے ساتھ سوگ میں ہے ساری سلطنت

یہ موت وہ ہے جس پہ کہ ہے زندگی نثار
ہے کارنامہ تیرا سیاست کا شاہکار

دم سے ترے وقارِ دکن کو ثبات ہے
بیٹے کے کارناموں میں ماں کی حیات ہے

دنیا کبھی نہ بھولے گی اس نیک نام کو!
ترکے میں جس نے چھوڑا ہے سابع نظام کو!

سازِ غزل

بہ فیضِ دیدۂ گریاں سراپا گوہر افشاں ہوں!

بسوزِ آتشِ غم ہائے پنہاں سینہ بریاں ہوں!

بتاؤں کیا تمھیں، میں کون ہوں، کیا ہوں، بہر صورت

سراپا درد ہوں، اک ہستیٔ محروم درماں ہوں!

میں یکتا ہوں تڑپنے، تلملانے، جان دینے میں

کبھی برقِ جہندہ ہوں، کبھی میں ابرِ باراں ہوں

چمن میں پھول ہوں، گل میں برنگِ بُو ہنوں پوشیدہ

کہیں تعبیرِ ہستی ہوں، کہیں خوابِ پریشاں ہوں

گلستانوں میں آسودہ، بیابانوں میں آوارہ

طرب افزا فضا میں، ہمنوائے عندلیباں ہوں

تلاشِ گوہرِ مقصود میں مضطر ہے دل میرا
نظر وارستۂ بیمِ خزاں ہے، گُل بداماں ہوں!

مری فطرت کا ہر ذرّہ ہے محوِ خود فراموشی
بظاہر آئینہ ہوں اور بباطن رازِ پنہاں ہوں!

مثالِ شمع گریاں ہوں، برنگِ نے ہوں فریادی
کبھی ویرانہ مسکن ہے، کبھی زیبِ گلستاں ہوں

یہ دیکھی سی تو! تفسیر ہے جذباتِ پنہاں کی
نہ شاعر ہوں نہ اہلِ فن، نہ ہم بزمِ سخنداں ہوں!

مجھے کیا سازِ عشرت سے، مجھے کیا بازِ حسرت سے
بشیرؔ اس عالمِ ہستی میں، میں مانندِ مہماں ہوں!

سنہ ۱۹۲۷ء

کہاں تک کوئی وضع اپنی سنبھالے!
نظر آ رہے ہیں تماشے نرالے!

پرستارِ مغرب نہ کیوں کر ہو دنیا
بناتے نئے بُت ہیں تہذیب والے

گیا ذوق اہلِ نظر کی نظر سے
نئی روشنی کے ہیں سارے اُجالے

بلاوے یہ پھر کیوں اُنہیں آ رہے ہیں؟
بھری بزم سے جو گئے ہیں نکالے

جو لذت میسّر ہے ذوقِ طلب میں
نہیں اس سے واقف ترے عرش والے!

تو نیرنگیٔ روز و شب سے نہ اُکتا
زمانے ابھی اور ہیں آنے والے!

گئی آہ دنیا سے روشن ضمیری
کہ شاہیں بنے زاغ کی چلنے والے

نہ نکلیں گے کانٹے بشیرا اپنے دل کے
اگر ایک دو ہوں تو کوئی نکالے!

سنہ ۱۹۴۱ء

پریشاں پھول ہیں، خاموش بلبل آشیانوں میں!
الٰہی! شور سے کیا ہو رہے ہیں باغبانوں میں؟
جلا سکتے ہیں وہ دنیا کو اپنی آہِ سوزاں سے
نہاں رکھی ہے یہ طاقت خدا نے ناتوانوں میں
اسیری میں ہمیں عہدِ گزشتہ یاد آتا ہے
نہ بیٹھے ہم کبھی جی بھر کے اپنے آشیانوں میں
کوئی پھر مرحلہ تازہ ہُوا اب دشت و بیاباں میں
نہیں رنگینیاں باقی پُرانی داستانوں میں
بہت کچھ ہو چکا افشا، بہت کچھ ہونے والا ہے
سُنا ہے چل گئی ہے آج کل کچھ رازدانوں میں!

فرشتے بھی نہ تھے واقف کہ یوں بن جائے گی دنیا
نہاں رازِ حیاتِ دہر تھا گندم کے دانوں میں!
وہی شانِ کریمی ہے وہی اندازِ رحمت ہے!
حقیقت میں اثر باقی نہیں اپنی زبانوں میں!
ہماری نغمہ سنجی نے دکھایا گوشۂ زنداں
نہ ہوتے کاش ہم پیدا چمن کے خوش بیانوں میں!
بشیرؔ اپنی حقیقت کا پتہ ہم کو نہیں ملتا!
مآلِ زندگی اک چیستاں ہے چیستانوں میں!

۱۹۳۷ء

تجھ پہ کیا خاک اے زمیں ہوتا؟ | ہم نہ ہوتے تو کچھ نہیں ہوتا!
نہ یہ دنیا میں شورشیں ہوتیں | اور نہ یہ ذوقِ آہ وایں ہوتا!
زندگی نام ہے تڑپنے کا | جب سکوں ہو، سکوں نہیں ہوتا
حشر سو بار رونما ہوتا | دل کو آنکھوں پہ گر یقیں ہوتا
کس قدر دل نواز منظر ہے | کاش! بر جا دلِ حزیں ہوتا
کچھ بڑی بات تھی ید اللہی | تجھ کو اپنے پہ گر یقیں ہوتا!
آگے چرچے تھے جن کی باتوں کے | اُن کا اب ذکر تک نہیں ہوتا
دل میں اگلی سی بات گر ہوتی | حرفِ ناخواندہ دل نشیں ہوتا!

گردشِ چرخ، کہہ رہی ہے بشیر
جذبِ کامل سے کیا نہیں ہوتا! سنہ ۱۹۳۸ء

نہ کوئی راز داں اپنا، نہ کوئی ہمزباں اپنا
دلِ پُر داغ کے دم تک ہی عالم میں نشاں اپنا

پلٹ جاتی ہے قسمت بھی زمانہ جب پلٹتا ہے
نہ ہم ہیں شکوہ سنج اس کے نہ دشمن آسماں اپنا

تب و تابِ نظر حاصل نہ ہو جب تک تو کیا حاصل؟
اگر ہو بھی گیا بالفرض یہ سارا جہاں اپنا

نہیں ہے جذبۂ اظہار پابندِ زباں بندی
سرشکِ دیدۂ خونبار ہوگا ترجماں اپنا

بشیر اب گردشِ شام و سحر کی یاد باقی ہے!
کہاں تک ساتھ دے سکتے زمین و آسماں اپنا!

۱۹۳۱ء

کوئی ہے محوِ عیش و طلبگارِ زندگی
کوئی ہے شکوہ سنج و گرانبارِ زندگی

قسمت کی گردشوں سے زمانے کے جور سے
ہے زار، حالِ زار گنہگارِ زندگی

کچھ گول مول اس کی سدا چال ڈھال ہے
اک حال پر نہیں کبھی رفتارِ زندگی

زخمی ہوئے تھے پاؤں کہ دامن اُلجھ گیا
مشکل ہے رہ بہ وادیٔ پُر خارِ زندگی

ہاں اے اجل زیادہ نہ مٹی خراب کر
زندانِ زندگی میں ہوں بیزارِ زندگی

تدبیر کچھ رہائی کی رنج و محن سے کر
تقدیر نے کیا ہے گرفتارِ زندگی

پنہاں ہیں خار کسوتِ گُل میں ہزار ہا
ہشیار! دلفریب ہے گلزارِ زندگی

رشتہ نگاہ و فکر کا باقی نہ رکھ اجل
میرے بدن سے کھینچ لے زنّارِ زندگی

بودم ز باد و خاک و ہشتم ہوا و حرص
اب ہوں بشیر دُور زِ پیکارِ زندگی!

سنہ ۱۹۲۷ء

خار میری نظر میں خار نہیں! کم نگاہی، مرا شعار نہیں!
موت کے بعد بھی تو جینا ہے زندگانی پہ اختیار نہیں!
بے قراری ہے زندگی میری جس کو آٹھوں پہر قرار نہیں
اُس کی مرضی بھی کوئی مرضی ہے جس کو مرضی پہ اختیار نہیں
شرح چھپنے لگی انا الحق کی حق کی تلوار۔۔۔ آبدار نہیں!
جلوہ گر ہے خودی مری ہر سو گو خدائی پہ اختیار نہیں

عہدِ حاضر کی زندگی میں بشیر
غمِ ہر لحظہ سے قرار نہیں!

سنہ ۱۹۴۴ء

یادِ رفتگاں

ورقِ غم

۱۳۴۶ ہجری

(والدہ مرحومہ کی رحلت پر)

خامۂ قدرت نے کیا کیا، لکھ دیا تقدیر میں　　غم کے مضموں بھر دئے اس مختصر تحریر میں

چوکتا انساں نہیں، گو ممکنہ تدبیر میں　　پر اثر الٹا ہی آتا ہے نظر تاثیر میں

آدمی مجبور ہے، زندانیٔ تقدیر ہے!

گردشِ ایام کی زنجیر عالمگیر ہے!

سو رہے ہیں قبر میں، اب قصر والوں کے مکیں　　خاک میں روپوش ہیں، کل تک جو تھے مسند نشیں

گنگ ہیں کیا کیا لبِ معجز بیاں زیرِ زمیں　　مٹنے والے صفحۂ دل سے یہ نقشِ غم نہیں

ہے حباب آسا جہاں میں زندگی انسان کی!

بارآور کیسے ہو، آسودگی انسان کی؟

اے اجل تیرے ہی ہاتھوں سے ہوئے برباد ہم گھر کو ویراں دیکھتے ہیں، دشت کو آباد ہم!
قافلہ جاتا رہا، روتے رہے ناشاد ہم آشیاں جلتا رہا، کرتے رہے فریاد ہم!

تیرِ غم کا ہائے دنیا میں نشانہ ہم رہے!
خود نظیر اپنی رہے، اپنا فسانہ ہم رہے!

وہ چمن اپنا تھا جس میں تھی سدا رہتی بہار آبیاری جس کی خود کرتا رہا پروردگار
سیر جس کی جاں فزا تھی جس کا منظر خوشگوار خوشنوا طائر تھے جس کے، پھول جس کے عطر بار

خوفِ گلچیں تھا، نہ کچھ اندیشۂ صیاد تھا!
درحقیقت یہ چمن کیا تھا نشاط آباد تھا!

آہ! اے نیرنگیٔ دورِ زماں، افسوس ہے! وہ گلستاں ہوگیا نذرِ خزاں افسوس ہے!
بے خبر یوں سوئیں اُس کے باغباں افسوس ہے! کچھ نہ ہو اندیشۂ سود و زیاں افسوس ہے!

ہے صفِ ماتم بپا اور گُل گریباں چاک ہیں!
خاک بر سر ہے صبا، غنچوں کے دل غمناک ہیں!

محفلیں برہم ہوئیں اب چار سو ویرانہ ہے — اب نہ وہ میکش نہ وہ ساقی نہ وہ میخانہ ہے
مطربِ شیریں نوا ہے اور نہ وہ پیمانہ ہے — یادگارِ عیش اک بھولا ہوا افسانہ ہے

"ہست انجامِ نشاطِ کامراں افسردگی!
اشک افشانی ست در دنیا مآلِ خرمی!"

پہلے ماتم تو کریم النفس خواہر کا رہا — مصطفیٰ بھائی نے داغ سینہ پھر تازہ کیا
بھائی حامد نے غمِ فرقت میں پھر تڑپا دیا — اور بہن خورشید نے ٹھانی، سوئے ملک بقا

آہ کیا ہنگامۂ محشر بپا تھا اُس گھڑی!
والدِ مرحوم نے پہنا کفن تھا جس گھڑی!

چل بسے دنیا سے خالو عیسیٰ اعجاز بیاں — ہو گئے رخصت مرے ماموں حفیظِ مہرباں
آنکھ سے تھمنے نہ پائے تھے ابھی اشکِ رواں — نانی اماں بھی سدھاریں سوئے گلزارِ جناں

دل میں تازہ ہو گئے پھر سارے غم ہائے قدیم!
جس گھڑی بھائی لیاقت کے ہوئے بچے یتیم!

نوجواں قطب النسا، یعنی مری پیاری بہن
زندہ دل، روشن جبیں، خورشید رو، سیمیں بدن
باحیا، ذی علم و فن، جادو بیاں، شیریں سخن
جس کی اخلاقی ضیا سے تھی منور انجمن

ہائے! وہ بھی دہر سے ناشاد رخصت ہو گئیں!
تین معصوموں کو روتا چھوڑ کر، خود سو گئیں!

ہم ابھی بھولے ہوئے تھے آخری انجام کو
یاد تھی رنجِ گزشتہ کی، دلِ ناکام کو
تھی عداوت ہم سے باقی گردشِ ایام کو
تھا ہمارے سر پہ چھانا بے کسی کی شام کو

ناگہانی اک بلا آئی قیامت کی طرح!
رو رہی تصویر تھی، برگشتہ قسمت کی طرح!

"انفلوئنزا" کا یوں تو ہو چکا تھا گھر شکار
جس کو دیکھو مضطرب تھا، جس کو دیکھو بیقرار
دن کو ہو تا رات کا، اور شب کو دن کا انتظار
ایسے میں اک دن مری امی کو بھی آیا بخار!

کیا خبر تھی، ایک چنگاری سے گھر جل جائے گا!
آفتابِ مہرِ اُلفت یک بیک ڈھل جائے گا!

ہم دعائیں مانگتے تھے جن کی صحت کے لئے
حکم جاری ہو چکا تھا اُن کی رخصت کے لئے!

کوششیں ہوتی رہیں، دفعِ علالت کے لئے
ہم شفا کے منتظر تھے، موت ساعت کے لئے!

مجھ کو یہ سارا جہاں تاریک آتا تھا نظر!
والدہ بھی مضطرب تھیں، میرے حالِ زار پر!

دیکھنا وہ یاس سے دیوار و در جاتے ہوئے
بے ثباتیٔ جہاں کا راز سمجھاتے ہوئے

وہ محبت سے مجھے نزدیک بلواتے ہوئے
ناتواں ہاتھوں سے میرے بال سُلجھاتے ہوئے

سو تمناؤں کا مظہر، آہ وہ اک پیار تھا!
یعنی ماں کی مامتا کا، آخری اظہار تھا!

کس کو ہوگی میری دم بھر کی جدائی ناگوار؟
کون اب میری پریشانی پہ ہوگا بے قرار؟

صبح دم اٹھنے کا اب کس کو رہیگا انتظار؟
کون دیگا اب دعائیں، دیکھ کر بے اختیار؟

ہائے کیا نغمے تھے، تیری زندگی کے ساز میں!
اک سرودِ روح افزا تھا، تری آواز میں!

مضطرب رکھتی ہے مجھکو فرقتِ اُمّ و پدر!
خون روتے ہیں مرے قلب و جگر شام و سحر!
اُن کی شفقت، اُن کی الفت یاد آتی ہے اگر
دل تڑپ جاتا ہے، اور جلتا ہے سینے میں جگر!

ایک ہنگامہ بپا، اِس قلبِ سیمابی میں ہے!
سیلِ اشکِ خوں فشاں اِس چشمِ عنّابی میں ہے!

دل تڑپنے کو، جگر ہے آہ و زاری کیلئے
پیٹنے کو سر ہے آنکھیں، اشکباری کیلئے
دن ملا رونے کو، شب اختر شماری کیلئے
وقف اپنی زندگی ہے، سوگواری کیلئے

غم نصیبی کے لئے پیدا ہوئی جانِ حزیں!
اور ستم سہنے کو، پہلو میں دلِ اندوہگیں!

اُٹھ گئی دنیا سے میری مادرِ شیریں زباں
جس کی شمعِ علم سے روشن تھی بزمِ خاندان
صاحبِ علم و عمل، جادو رقم معجز بیاں
تھے گلستاں جس کے مضموں، طبع جسکی بیکراں

اپنے اخلاق و سخائے تھیں دوائے دردمند!
زندگی بھر وہ رہیں حاجت روائے دردمند!

وصف تھا ہر دلعزیزی کا جو اُن کی ذات میں
دل نشیں تھا ہر سخن، تاثیر تھی ہر بات میں

وہ ہمیشہ منہمک تھیں، خیر میں خیرات میں
حسنِ استقلال تھا ضرب المثل آفات میں

بزمِ دنیائے نسائیت کی زینت اُن سے تھی!
صاحبِ عزت تھیں وہ، ہم سب کی عزت اُن سے تھی!

صفحۂ ہستی پہ وہ جو خلق کی تصویر تھی
آیۂ تعلیمِ نسواں کی جو اک تفسیر تھی

محفلِ نسواں میں جس کی ہر صدا تکبیر تھی
جس کی ہستی، بزمِ اعلیٰ میں بھی باتوقیر تھی

آہ! اب وہ شمسِ[1] نسواں، ظلمتِ تربت میں ہے!
روحِ تاباں اُس کی حق کے دامنِ رحمت میں ہے!

اے مری غمخوار مادر! تجھ کو میں پاؤں کہاں!
عہدِ طفلی میں تری آغوش تھی میرا مکاں

کتنے جوکھم میں رہی ہے میری جانِ ناتواں
بات کرنے سے بھی جب واقف نہ تھی میری زباں

جامہ زیبی سے تعلق تھا، نہ خورد و نوش سے!
عقل سے بیگانگی، ناواقفیت، ہوش سے!

[1] (شمس النساء بیگم والدہ مرحومہ کا نام)

ہم نے تیرے شیر سے جوشِ نمو حاصل کیا
تو نے گاڑھے وقت میں حل عقدۂ مشکل کیا
فکر سے، غم سے، مصیبت سے ہمیں غافل کیا
تو نے کن کن محنتوں سے ہم کو اس قابل کیا!

آہ کیا کیا خوبیاں تھیں ایک تیری ذات میں!
مہرِ الفت چھپ گیا، غم کی اندھیری رات میں!

شب کے سناٹے میں رہتے جبکہ سب سوتے ہوئے
بارہا پایا تجھے، اشکوں سے منہ دھوتے ہوئے
قبلہ رو سجدے میں مصروفِ دعا ہوتے ہوئے
بارگاہِ ایزدی میں پھوٹ کر روتے ہوئے

یاد ہیں اب تک ہمیں وہ تیری خدمت گزاریاں!
دن کی وہ غمخواریاں، راتوں کی شب بیداریاں!

قبر کی ظلمت سے، تو اے کامیابِ زندگی!
دیکھ اب! فردوس ہیں، تعبیرِ خوابِ زندگی!
موت کی منزل میں ہے پوشیدہ بابِ زندگی!
بحر ہوتا ہے بالآخر یہ حبابِ زندگی!

موت کیا ہے؟ اصل میں ہے اک پیامِ زندگی!
مرگ ہے اک زینۂ دشوار بامِ زندگی!

گو یہ خاموشی و روپوشی تری غمناک ہے
تیری فرقت سے جگر پُر داغ ہے، دل چاک ہے

پر ترا دل شورشِ دنیا سے اب بیباک ہے
روح تیری محنت و زحمت کشی سے پاک ہے

دہر میں راحت نہ پائی گردشِ ایام سے!
گوشۂ مرقد میں اب ہوگی بسر آرام سے!

دہر میں غمگیں تھی تو، فردوس میں مسرور ہو!
قربِ ایزد ہو میسّر، ساری کلفت دور ہو!

تیری تربت جلوۂ انوار سے معمور ہو!
جسمِ آسودہ ترا زیرِ قبائے نور ہو!

اے مقدّس روح! جنت میں خدا رکھے تجھے!
حشر تک آغوشِ رحمت میں خدا رکھے تجھے!

۱۹۲۸ء

رُودادِ دلخراش

۱۳۵۰ ہجری

(اپنے شفیق خُسر کی یاد میں)

وہ اُٹھا دل سے دھواں، رخصت ہوئے صبر و قرار! — سینۂ خالی میں ہے اب آرزوؤں کا مزار!

یا ابی! یا مشفقی! یا محسنی! فریاد ہے — المدد! اے سرپرستِ کیلنِ خدمت گزار!

اے کہ تیرے غم میں ہیں زیر و زبر دیوار و در — اے کہ تیری یاد میں رہتی ہیں آنکھیں اشکبار

مطمئن تھے ہم کہ اب تو رو بہ صحت ہے مزاج — کیا خبر تھی اس کی، ہو گا انقلابِ روزگار

ہو کے صحت پھر دوبارہ جان کے لالے پڑے — آہ کس منحوس ساعت میں تجھے آیا بخار!

اب کہاں وہ دن کہ تیری دید حاصل تھی ہمیں — خواب یکسر ہو گیا، اپنا وہ عہدِ خوشگوار

زندگی بھر سینکڑوں تجھ پر ستم ہوتے رہے — تو نے پروا تک نہ کی، آہ، فغاں تو درکنار!

عہد تیرا استوار، اور عزم تیرا مستقل
لوحِ ہستی پر رہے گا، نام تیرا پائیدار

خوبیوں میں کونسی خوبی ہے جو تجھ میں نہ تھی
راستی تیرا چلن، ایثار تھا تیرا شعار

پُر مئے اوصافِ عالی سے تھا جامِ زندگی!
قابلِ تقلید ہے تیرا نظامِ زندگی!

تیری صحت کی ہمیں، جو فکر صبح و شام تھی
عین ناکامی میں گویا کوششِ ناکام تھی

پانچویں ذی الحجہ کی وہ صبحِ قیامت الاماں
صبح تھی سارے جہاں میں اپنے گھر میں شام تھی

موت کے ہلکے سے دھکے سے نہ سر بر ہو سکی
زندگی کیا تھی تری گویا بلوریں جام تھی

ہوش برجا گو نہ تھے پر ذکرِ حق تھا ہر گھڑی
کس قدر اس نیک دل میں الفتِ اسلام تھی

اسم تیرا بامسمیٰ، یعنی اکرامِ علیؑ
تیری ہستی درحقیقت! حیدرؓی اکرام تھی

باعثِ بہبودیٔ مخلوق تھا تیرا وجود
وقف تیری زندگی بہرِ رفاہِ عام تھی

صرف کی ہے تو نے اپنی عمر کارِ خیر میں
تیری یہ بے لاگ خدمت قابلِ اکرام تھی

پاک تھے تیرے ارادے اور عمل خاموش سب
کون کہتا ہے تجھے فکرِ نمود و نام تھی!

کیوں نہ چھا جائے اندھیرا جبکہ تو روپوش ہو!
کیوں نہ ہو ہنگامہ برپا جب کہ تو خاموش ہو!

ہائے کیا کیجے بیاں! لطفِ بیاں جاتا رہا — اب کہاں قدرِ سخن؟ جب قدرداں جاتا رہا

لوگ کہتے ہیں مجھے ذوقِ سخن اب کیوں نہیں؟ — ذوق کیا باقی رہے جب فوق داں جاتا رہا

داد دیگا کون اب، سن کر مرے اشعار کی — شمعِ محفل، اور چراغِ خانداں جاتا رہا

پھول گلشن میں کھلیں، لاکھوں مگر کیا فائدہ؟ — سب بہاریں ہیچ ہیں! جب باغباں جاتا رہا

مجھکو یاں تک لائیں جس کی حوصلہ افزائیاں — آہ وہ محسن، مربی، مہرباں جاتا رہا

چھا گئی ظلمت نظر میں نوبتِ ادبار ہے — آج گھر سے مہرِ تاباں کا نشاں جاتا رہا

وائے ناکامی کہ جس کے سایہ میں رہتے تھے ہم — وہ سہارا اُٹھ گیا، وہ سائباں جاتا رہا

کیوں نہ اب آئے تباہی، کیوں نہ چھائے بیکسی؟ — کیا غضب ہے! سرپرستِ خانداں جاتا رہا

رحم کر ظالم، کہ آخر ظلم رانی تا بہ کے؟ — ہاتھ سے اب دامنِ صبر آسماں جاتا رہا

آہ فخرِ خانداں نے لے لیا کنجِ مزار!
کام کب آئے گی تو جانِ بشیرِ جاں نثار!

یوں تو سمجھائیں گے سب، پر دل سے سمجھائیگا کون؟ چل بسا غمخوار مشفق، اپنا غم کھائیگا کون؟

اور ہوں گے یوں تو واعظ بھی، مقرر بھی مگر کھینچ کر تصویرِ فطرت، دل کو تڑپائے گا کون؟

فلسفی اور نکتہ رس، مانا کہ بہتیرے ہیں یاں نت نئی باریکیاں پر ہم کو دکھلائے گا کون؟

کس سے پوچھیں گے؟ نکاتِ زندگی طرزِ معاش! ایسے پیچیدہ مسائل ہم کو سمجھائے گا کون؟

گردشِ دوراں کی زد سے ہم بچیں گے کس طرح درسِ استقلال و ہمت ہم کو سکھلائیگا کون؟

کارنامے اپنے، یوں تو سب کو آئیں گے نظر حوصلہ افزائیوں سے ہم کو گرمائے گا کون؟

اک قیامت ہے جہاں میں عالم و فاضل کی موت!

موت محفل کی ہے یکسر، ساقیٔ محفل کی موت!

زندگی خوابِ گراں، موت کی تعبیر ہے موت کیا ہے؟ زیست کی بیجان اک تصویر ہے

ہو کے رہتا ہے، جو قسامِ ازل نے لکھ دیا سامنے تقدیر کے بیکار سب تدبیر ہے

ہیں اسیرِ حلقۂ دامِ اجل شاہ و گدا زندگی کا جس سے بل نکلے، یہ وہ زنجیر ہے

الغرض، بننا بگڑنا قدرتی قانون ہے! منحصر انساں پہ کیا، یہ موت عالمگیر ہے!

شعلۂ غم سے ہے قائم گرمیٔ بازارِ حسن
نغمۂ دلکش، رہینِ نالۂ دلگیر ہے

پھول کھلتے ہیں چمن میں سوکھ جانے کیلئے
موسمِ گل کو، خزاں کا خوف دامنگیر ہے

ہے زوال آمادہ یہ سارا نظامِ کائنات
موت کے اجزا سے موجودات کی تعمیر ہے

بستیاں بستی ہیں دنیا میں اُجڑنے کے لئے!
صورتیں بنتی ہیں عالم میں بگڑنے کے لئے!

عمر بھر اکرام تیرے ہم کو خوں رُلوائیں گے
دم میں دم جب تک ہے تیری داستاں دہرائیں گے

روئیں کس کس کیلئے؟ اور یاد کس کس کو کریں؟
مرنے والے اس طرح کب تک ہمیں تڑپائیں گے

زیست اپنی جب رہینِ بختِ برگشتہ رہی
مر کے بھی کنجِ لحد میں ہم نہ راحت پائیں گے

ذرہ ذرہ کو اڑا دے گی ہوائے نیستی
موت کے چکر میں آ کر سب فنا ہو جائیں گے

جا ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
جلد آتا ہے وہ دن جب ہم بھی یاں سے جائیں گے

نامِ نامی سے ترے وابستہ ہے اپنی نمود
نام لیوا ہیں ترے، تیرے ہی ہم کہلائیں گے

کس طرح بھولے گی دنیا تجھ کو فخرِ روزگار!
تو نہ ہوگا، کارنامے تیرے ہوں گے یادگار!

جو کوئی آلامِ ہستی سے سبک داماں رہے
اُس کو کیا؟ کوئی قتیلِ گردشِ دوراں رہے

جا نہیں سکتی فغاں اپنی فضائے چرخ تک
تجھ کو کیا پروا، زمیں پر گر کوئی نالاں رہے

مطمئن ہے روح تیری، دنیوی افکار سے
تجھ کو کیا غمگیں ہو کوئی یا کوئی شاداں رہے

بے نیازِ غم ہے تیری روح اب افلاک پر
کیا غرض تجھ کو، زمیں پر قحط یا باراں رہے

صحبتیں ہیں گرم تیری، ساکنانِ خلد سے
کیا تجھے دنیا اگر آباد یا ویراں رہے

ہو مبارک! پاک ہستی! آسمانی زندگی
رُوح پر تیری، خدا کا لطفِ بے پایاں رہے

گوہرِ رحمت کی بارش تیری تربت پر رہے!
مہرباں تجھ پر ہمیشہ، داورِ محشر رہے!

۱۹۳۲ء

یادش بخیر

(والدِ مرحوم کی تصویر دیکھ کر)

اے قبلۂ بشیرؔ! سزاوارِ احترام — کتنا بلند ہے مرے دل میں ترا مقام!

روشن ضمیر و پاک دل و صاحبِ وقار — تصویر سے بھی تیرا تقدس ہے آشکار!

مرعوب تیرے سامنے ہر باکمال تھا — وہ تیری بارگاہ میں جاہ و جلال تھا

مدت ہوئی کہ دید سے محروم ہے نظر — لیکن ہے دل میں یاد تری نقشِ کالحجر!

وابستہ تیرے نام سے میری حیات ہے — تیرا ہی التفات، مری کائنات ہے

تجھ سے مری نگاہ کو ذوقِ نظر ملا — تیرے کمال ہی سے جلالِ ہنر ملا

تیری شعاعیں جذب ہیں میری حیات میں — تیرے تاثرات ہیں ضم میری ذات میں

روحانیت کا ذوق رگ و پے میں بھر دیا — تیری خود آگہی نے خود آگاہ کر دیا

فطرت میں میری بس گئیں رعنائیاں تری
آسودہ مجھ میں ذہنی توانائیاں تری

پالا ہے تیرے علم نے میرے شعور کو
تو نے ہی دی جِلا، مری طبعِ غیور کو!

واقف کیا ہے تو نے نشیب و فراز سے
معمور دل ہے تیری نواہائے راز سے

تیری توجہات کا زندہ ثبوت ہوں
سرگرمیوں کا عکس، برنگِ سکوت ہوں!

تیرے ہی نقشِ پا سے ملا جادۂ وقار
تیرے وجود کی مری ہستی ہے یادگار!

اُبھرے ہیں تیرے فیض سے میرے تاثرات
میری حیاتِ شعر کی مظہر ہے تیری ذات!

گو مضطرب ہوں، پر یہی وجہِ سکون ہے!
میرے دل و جگر میں رواں تیرا خون ہے!

۱۹۴۳ء

نقوشِ کامل

(مولانا احمد حسین صاحب بالیمیں کے وصال پر)

جانِ عزیز داشتے، داد بجان آفریں — واقفِ وہم زیست بود، زود بہشت بالیقیں

آہستہ گُل فشاں بشیر، دانی کہ کیست محوِ خواب؟ — آرام گاہِ کاملے "نظر اللہ بالیمیں"!

۱۳۵۹ھ

احمد حسین بالیمیں! قبلہ کاملِ الیقیں — عقدہ کشائے سالکیں، رونقِ بزمِ عارفیں!

واقفِ سرِّ کُن فکاں، کاشفِ رازِ ہست و بود — جس کی نگاہِ پاک بیں، شاہدِ "وحدت الوجود"!

طبعِ سلیم دل غنی، طرزِ کلام دل نشیں — سوزِ دروں سے ہر نفس، چہرہ کشائے علمِ دیں

ہر لحظہ ہر دمِ حیات، محوِ ہوائے کبریا — راہِ عمل میں ہر قدم تابعِ خلقِ مصطفیٰ!

وہ رعبِ فقر و برتری، آنکھیں نہ ہم ملا سکیں — جی میں ارادے ہوں بہت، منہ سے نہ کچھ بتا سکیں

پایا سُراغ "ایک" کا اس ایک کے سراغ سے | صدہا چراغ ہو گئے روشن اس اک چراغ سے

تفہیمِ بے مثال سے حق کا پتہ بتا دیا!
بڑھ کے کمالِ بالیقیں، فخرِ کمال ہو گیا!

شعلۂ عشق دے گیا، مہرِ خنک اساس تو! | چھوڑ گیا نقوشِ حق، رہبرِ حق شناس تو!
اے کہ تری حیات نے بخشی نجات و آگہی | ظن و گماں کی قید سے، ہم ہوئے آن میں رہا
اے کہ ترے حضور میں روشنی حضور تھی | تیرا جمالِ پاک تھا، قلب و نظر کی زندگی
دل محوِ حسنِ لایزال اور قال عینِ حال تھا | ضبطِ جلال میں تجھے اک قدرتی کمال تھا
تیرے ضمیرِ پاک کا، ہر دم، دمِ حضور تھا | ہر ذرّہ کائنات کا تیری نظر میں طُور تھا!
حاضرِ بزمِ فیض یاب، محمود ہو وہ یا ایاز | محفل میں تیری عام تھی، اک دولتِ سکوں نواز
کیوں ہیں ملول بے خبر، تیرے وصالِ پاک پر | اُڑتے ہیں سوئے لامکاں، ہوتے ہیں جن کے بال و پر
صبحِ حیاتِ عشق کی رنگین شام ہے یہی | "اہلِ فراق کے لئے، عیشِ دوام ہے یہی!"
تیری حیات دائمی روح تری ہے "لایموت" | یہ عارضی نمود تھی، تیرے ثبات کا ثبوت!

تیرا خلوص یاد ہے، تیرے پیام یاد ہیں!
تو ان کے ساتھ ساتھ ہے پابند تیرے شاد ہیں!

۱۹۴۰ء

مصورِ غم

راشدالخیری! ادیبِ پاک بیں، روشن ضمیر
آج تک بھی تیری ہستی آپ ہے اپنی نظیر!

تیرے زریں کارناموں پر ہے نازاں زندگی
تو نے دی ہندوستاں کو خانگی آسودگی

آہ وہ دورِ تباہی، وہ جمودِ خانہ سوز
یاد ہے وہ عہدِ رفتہ کا سبق ہم کو ہنوز!

صنفِ نازک نام ہے جن ناتواں افراد کا
ہر زمانے میں رہا جس کو گلا بیداد کا

ظلم کیا کیا ڈھائے اس پر جذبۂ خودکام نے
کب رکھا آسودہ اس کو گردشِ ایام نے

الغرض کیسا زمانہ اس پہ گزرا ناگہاں!
بادۂ غفلت سے جب سرشار تھا ہندوستاں!

تختۂ مشقِ ستم تھی، موردِ آفات تھی
ایک مٹی کا کھلونا یعنی عورت ذات تھی

خود شریکِ زندگی سے آدمی کو عار تھا
خاک آلودہ سراسر دامنِ زرتار تھا

علم کی تحصیل سم اس کے لئے لاریب تھا
خواہ کچھ پڑھ لے، مگر لکھنا سراسر عیب تھا

ایک کمسن طفل کی گھرکی سے ڈر جاتی تھی وہ
زندگی بھر اس طرح گھٹ گھٹ کے مرجاتی تھی وہ

تھا ستم کا دور دورہ، دادرس کوئی نہ تھا
شمعِ محفل تھی فروزاں، ہم نفس کوئی نہ تھا!

گھر جہنم بن چکے تھے جہل کی بیداد سے!
ایسے میں اک غمگسار اُٹھا جہاں آباد سے!

مرحبا! اے راشد الخیری، ادیبِ حق شناس
برگزیدہ تیری ہستی، پاک تھا تیرا قیاس

مرحبا! اے حامیٔ نسواں، شفیقِ بیکساں
اے سزاوارِ عقیدت نازشِ ہندوستاں!

اے پرستارِ صداقت، قابلِ صد احترام
آج تک زندہ ہے اور جاں بخش ہے تیرا پیام!

اے ادیبِ پاک طینت، اے حکیمِ دادرس
کتنے موزوں وقت پر تو نے بجایا ہے جرس!

تیرے دردانگیز نالے کارگر یکسر ہوئے
تیرے دلکش ساز سے آباد ہندی گھر ہوئے

خامہ فردوس آفریں تھا اور نوائیں جاں نواز
تیری ہر اک آہ سمجھاتی رہی فطرت کے راز

حق و باطل، خیر و شر سے باخبر تو نے کیا
نظمِ استبداد کو زیر و زبر تو نے کیا

تو نے بخشی ہے حقوق و حریّت سے آگہی!
پھونک دی تو نے گھریلو زندگی میں زندگی!

خون رو رو کر رُلایا سنگ دل افراد کو
تیری آہوں نے تپایا ہے دلِ فولاد کو

طبقۂ اہلِ قلم، گُم شعبدہ کاری میں تھا
اور تو تنہا خواتین کی طرفداری میں تھا

کوششیں تیری رہیں دورِ درخشاں کیلئے
وقف کر دی زندگی امدادِ نسواں کیلیئے

تیری جاں سوزی برائے طبقۂ مظلوم تھی
تیری تحریروں کی دنیائے ادب میں دھوم تھی

لکھنے والوں سے جدا لکھنے کا تیرے ڈھنگ تھا
رنگ آمیزی پہ تیری اک زمانہ دنگ تھا

تیری صبح و شام سے برپا نشانِ زندگی!
تیری صبح و شام و شب سے زندگی پائندگی!

الغرض تو بے غرض، بے لاگ خدمت کر رہا
لاکھوں اُجڑے گھر بسائے لاکھوں دل میں گھر کیا

توڑے ہیں بندِ غلامی تیری تحریکات نے
گُر پنپنے کے سکھائے تیری تصنیفات نے

تیری دل سوزی کا نسوانی ادب ممنون ہے
جس کی رگ رگ میں رواں تیرے جگر کا خون ہے!

زندۂ جاوید تیرے کارنامے اور پیام — صنفِ نسواں پر سدا واجب ہے تیرا احترام!

آج اے غمخوارِ نسواں بے نیازِ غم ہے تو!

دامنِ رحمت میں شاداں محسنِ اعظم ہے تو!

۱۹۴۳ء

جانبازِ ملّت

(قائدِ ملّت نواب بہادر یار جنگؒ کی اچانک رحلت پر)

آہ! اک درماندہ مفلس قوم کا چشم و چراغ!
منکشف جس کی نگاہوں پر تھے منزل کے سراغ!

چل رہا تھا قوم کو لے کر اندھیری رات میں
اور گُم آفاق تھے، اُس کی مقدس ذات میں

مطمئن ملّت تھی، میرِ کارواں بشّاش تھا
جادۂ منزل کا ایک اک راز اس پر فاش تھا

صبح کے آثار پیدا تھے فضا پُر نور تھی!
اور دکھائی دے رہی تھی، منزلِ مقصود بھی!

آہ! ایسے میں اچانک ایک طوفاں آگیا!
چھا گئیں تاریکیاں، اور کارواں لوٹا گیا!

آہ! کس منہ سے کہوں میں سو گیا شیرِ دکن!
وہ کہ جس کے نام نے زندہ کیا نامِ وطن!
جس کے ہر انداز سے تھی سطوتِ مومن عیاں
جس کی پیشانی پہ تاباں تھے قیادت کے نشاں
جس کی جاں پُرسوز تھی، جس کا سخن تھا دلنواز
جس کی آہیں کارگر، جس کی نگاہیں کارساز!
اُس کے مرنے کی خبر ویرانیاں برسا گئی
ملّتِ اسلامیہ پر مُردنی سی چھا گئی!
منتشر شیرازۂ تنظیمِ ملّت ہو گیا
فرطِ غم میں ہر کس و ناکس سراپا کھو گیا

برق آسا گردشِ دوراں نے ڈھایا انقلاب!
دوپہر کی چھاؤں میں ڈوبا دکن کا آفتاب!

اے بہادر یار جنگ! اے قائدِ روشن ضمیر!
صاحبِ الہام، دربارِ رسالت کے سفیر!

اے امیرِ کارواں، اے تاجدارِ حریت
تجھ سے قائم تھی جہاں میں رفعتِ انسانیت!

اے شہنشاہِ خطابت! نازشِ اردو زباں
کس قدر نازاں تھی تجھ پر مادرِ ہندوستاں!

دردمندوں کا، غریبوں، مفلسوں کا غمگسار
سلطنت کا پاسباں، شاہِ دکن کا جاں نثار!

اے امیرِ پاک بیں! درویشِ دل جاگیردار
خدمتِ مخلوق، اور ایثار تھا تیرا شعار!

تو غریبوں میں غریب، اور تھا امیروں میں امیر
حق پرستی پر سدا قائم رہا تیرا ضمیر!

تیرے حُسنِ خلق کی تاثیر عالمگیر ہے!
آج دل میں ہر مسلماں کے تری تصویر ہے!

برقِ ایمن تھا سراسر، تیرا اندازِ بیاں
عزم سے تیرے لرزتا تھا، غرورِ آسماں
ٹولیاں لاکھوں کی، آتی تھیں تری آواز پر
دنگ رہتا تھا زمانہ اس ترے اعجاز پر
وہ تدبّر، وہ فصاحت، وہ نوائے آتشیں
آگ بھڑکاتا دلوں میں وہ ترا سوزِ یقیں!
تیرا ہر اندازِ ہر حالت میں جاں پرور رہا
جو ترے دل میں رہا، وہ سب سے منوا کر رہا!

عظمتِ مسلم کے مظہر، وہ ترے اجلاسِ عام
جشنِ نوروزی مناتی تھی شبِ دار السلام!

جگمگاتے شہ نشیں پر، جلوہ فرمائی تری
اور انسانی سمندر پر وہ دارائی تری

یاد ہیں وہ تیری رنگا رنگ بزم آرائیاں
وہ تری شعلہ نوائی کی فلک پیمائیاں

دم بخود رکھتی تری تقریر کی جادو گری
صبح تک بھی گرم رہتی تھی وہ بزم ساحری

تیری یکسر خاموشی پر، اب ہر اک حیران ہے!
ہے دکن ویران اور ہندوستاں سنسان ہے!

کیسے کیسے آئے ہیں طوفان تیرے سامنے!
کس قدر موزوں تھے تیرے ہاتھ اُن کو تھامنے!

سابقہ تیرا بہار و باد و باراں سے رہا
ہر جنوں وابستہ تیرے ہی گریباں سے رہا
آہ، تیری جان کتنے بار جوکھم میں رہی
منہمک، پر تیری ہمت سعیٔ پیہم میں رہی
معرکہ تیرا سراسر سحر باطل سے رہا
واسطہ تجھ کو ہمیشہ اپنی منزل سے رہا
آزمایش کے کبھی تو مرحلے درپیش تھے
اور کبھی بادِ مخالف کے چلن دل ریش تھے
مسلکِ شاہیں کی پیرو، تیری ہر تلقین تھی
جاہ و دولت کی کشاکش میں تری توہین تھی!
اپنی شخصیت پہ تو نے کر دیا سب کچھ نثار
دیکھ! ہے کتنی بلندی پر ترا ذاتی وقار!

کرتے ہیں گردش ہزاروں سال جب شام و سحر!
مادرِ گیتی عطا کرتی ہے تجھ سا دیدہ ور!

تذکرہ "ذوقِ سفر" کا ہو رہا تھا سر بہ سر
دل میں کیا آیا کہ تو نے کر لیا عزمِ سفر!

ہو گیا اقبال میں گم تیرا نطقِ آخریں!
آفریں، صد آفریں! اقبال کے روح الامیں!

"عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام"
ہو گیا دم بھر میں رخصت، والیٔ "دار السلام"!

موت سے یاں، ماہِ ملت کا جو ماتھا ماند تھا
آسماں پر مضطرب چوتھی رجب کا چاند تھا!

ملتِ اسلامیہ کی کم نصیبی کی دلیل!
کاتبِ قدرت نے لکھی عمر جو اتنی قلیل!

---

[1] ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

قائدِ ملت انتقال سے قبل علامہ اقبال کے اس شعر کی تفسیر بیان فرما رہے تھے۔

آہ! وہ منظر، کبھی دنیا بھلا سکتی نہیں
کیفیت الفاظ کی صورت میں آ سکتی نہیں
تھا سرِ بالیں، تاسف میں دکن کا تاجدار!
سامنے بے جان تھا اس کا بہادر جاں نثار!
جو صداقت پر، بہر حالت رہا ثابت قدم!
کھائے گی تاریخ جس کی شہ پرستی کی قسم!
گونج اُٹھے شورِ ماتم سے زمین و آسماں!
قائدِ ملت ہوا جب دوشِ ملت پر رواں!
نوحہ گر تھی قافلے میں وحدتِ خیر الامم
سرنگوں تھے ملتِ بیضا کے مہتابی علم!
اُس جلوسِ منتشر کا "دیدہ ور" بے جان تھا
اِک قیامت کا سماں، مخلوق کا طوفان تھا!

جا رہا تھا آخری منزل کو میرِ کارواں!
تھے جلو میں کس مپرسی اور قلاکت کے نشاں!
ماہ و مہر و مشتری کیا؟ آسماں حیران ہے!
تیرے مرنے کی ادا پر زندگی قربان ہے!
یاد تیری ہر قدم پر بجلیاں برسائے گی!
ہائے اب تنظیمِ ملّت کیا سے کیا ہو جائے گی!!
اپنی من مانی کرے گی گردشِ لیل و نہار
جانشیں کا تیرے صدیوں تک رہے گا انتظار!
گر رہے بھی آسماں پر مدتوں اُس کے قریب
ہو نہیں سکتا شکوہِ ماہ، تاروں کو نصیب!
کھو کے سب الماس و گوہر اور "کوہِ نور" کو
حق سے پایا تھا دکن نے اک "سراپا طور" کو!

اُس کے دل کے نور سے اب بھی فضا معمور ہے!
"موت میں بھی زندگانی کی تڑپ مستور ہے"!

سنہ ۱۹۴۴ء

چند آنسو!

(قائدِ ملت کی آرامگاہ یعنی حظیرۂ مشیر آباد کے صحن میں)

اے مشیر آباد! کتنا بڑھ گیا تیرا وقار! — سو رہا ہے تیرے دامن میں دلوں کا تاجدار

سُرمہ سا، ہر ذرہ تیری خاک کا مرغوب ہے — تیرے سینے میں مسلماں قوم کا محبوب ہے!

ایک جذبِ اندروں سے تو نے پایا یہ مقام — ہے شکستِ آرزو پر نوحہ گر "دار السلام"

تیرے اِس سُنسان حظیرے میں جو محوِ خواب ہے — ملّتِ مظلوم کا سرمایۂ نایاب ہے!

ہر زمانے میں یہ کہتا گردشِ افلاک سے!
اک نیا خورشید اُبھر اٹھا دکن کی خاک سے!

سنہ ۱۹۴۴ء

مقامِ حالیؔ

ہر حال میں، حالی ہی رہے گا حالی!
ہر دور میں، جا اُس کی رہے گی خالی!
دُنیائے ادب اُس کو بھلائے کیوں کر؟
بنیاد نئے ادب کی جس نے ڈالی!

(۲)

سیدؔ کی دعاؤں کا اثر ہے حالی
غالبؔ کی اُمیدوں کا ثمر ہے حالی
اقبالؔ بھی معترف ہوا جس کا بشیرؔ
وہ خوش اقبال دیدہ ور ہے حالیؔ!

سنہ ۴۳ء

اقبالؒ سے

(ایسے سوالات، جو منت کشِ جواب نہ ہوئے)

مدّت سے تمنا تھی کہ لاہور کو جاؤں ! / اور سامنے اقبالؔ کے سر اپنا جھکاؤں !

رو رو کے کروں عرض کہ اے رہبرِ ملّت ! / کہنے کی اجازت ہو تو، کچھ اپنی سناؤں !

تعلیم تری اور ہے، یاں رنگِ جہاں اور / فطرت کو ہلاکت سے میں کس طرح بچاؤں ؟

یہ جرأتِ دل، جرم نہیں، خاورِ مشرق ! / ذرہ کو بھی حسرت ہے کہ خورشید کو پاؤں

زنجیرِ تو ہم میں مقید ہے تمدّن / اور روح کی خواہش ہے کہ شورش بپاؤں

فطرت کے خزانوں سے عطا کی گئی مجھ کو / یہ قوتِ پرواز کہ اُڑنے بھی نہ پاؤں !

رونے کا یہاں نام ہے کمزوریٔ فطرت / فرما کہ تڑپ دل کی میں کس طرح چھپاؤں ؟

سب کہتے ہیں اندازِ جنوں ہیں یہ نرالے / تو کہہ کہ کھلیں پھول، میں آنسو نہ بہاؤں ؟

یاں سجدۂ بیتاب سے ہوتا ہے گماں اور — کیا حسنِ شفق دیکھ کے میں سر نہ جھکاؤں؟

تڑپاتے ہیں کہسار و بیاباں کے نظارے — ساکت ہو قمر اور میں دریا پہ نہ جاؤں؟

بن دیکھے کسی چیز کا قائل نہیں کوئی — دودِ تپشِ داغِ جگر کس کو دکھاؤں؟

فریاد ہے اے داغِ جگر پالنے والے — کیونکر غمِ ہستی سے میں ہستی کو بچاؤں؟

یہ آب و ہوا، وجہِ پریشانئ دل ہے — فرما کہ تباہی سے یہ دل کیسے بچاؤں؟

میں منتظرِ ساعتِ اظہارِ تمنا — اور پیرِ فلک تاک میں، یہ راز نہ پاؤں

آئی یہ خبر! اُٹھ گیا مسلم کا سہارا!

اور اُمّتِ مرحوم کا اقبال سدھارا!

اک برقِ اَلم سوز گری خرمنِ دل پر — اے کوہِ الم ٹوٹ کہ رونے بھی نہ پاؤں

تاریکئ شب چھا گئی، رخصت ہوا خورشید — سایہ بھی گیا قوم کے سر سے گئی چھاؤں

یہ درد نہ ہوگا کبھی منّتِ کشِ درماں — وہ دولتِ نایاب کہاں ڈھونڈنے جاؤں؟

فطرت یہ سدا جس کی پرستار رہی ہے — قسمت میں یہ تھا شرفِ تکلّم بھی نہ پاؤں

جذباتِ تجسس رہے ناکام سراسر قدرت کا یہ مقصد تھا کہ تسکین نہ پاؤں!

اُس تک نہ گئی جب یہ صدائے دلِ محزوں!

اللہ نہ کرے میں کبھی لاہور کو جاؤں!

۱۹۳۸ء

داستانِ اقبالؒ

چھائے آثارِ خزاں جب گلستانِ ہند پر
اور گھرے ظلمت کے بادل آسمانِ ہند پر

ثبت مہرِ خاموشی تھی، جب دہانِ ہند پر
تھا نہ حرفِ مدعا اک بھی زبانِ ہند پر

زندگی اور موت کا احساس تک باقی نہ تھا
کوئی اس اُجڑے ہوئے میخانے کا ساقی نہ تھا،

جب تباہ ہونے کو تھے ہم مغربی سیلاب سے
آفتابِ قوم چمکا مطلعِ پنجاب سے!

زندگی کی لہر دوڑی اُس کی آب و تاب سے
نوجوانانِ وطن، اُٹھنے لگے پھر خواب سے!

دھیمی دھیمی دُور سے دلکش صدا آنے لگی!
کاروانِ خفتہ میں "بانگِ درا" آنے لگی!

جادہ پیما سوئے منزل کارواں ہونے لگا
پرچمِ اقبال کو تھامے رواں ہونے لگا

آسماں پر شہرۂ ہندوستاں ہونے لگا
ذرّہ ذرّہ زندگانی کا جواں ہونے لگا

"شکوہ" اہلِ زمیں افلاک پر جانے لگے
"بالِ جبریلِ" امیں سوئے زمیں آنے لگے

سازِ نو کی لے سے پھر ذوقِ کہن تازہ کیا
خونِ دل دے دے کے پژمردہ چمن تازہ کیا

کتنی بے باکی سے پھر نامِ وطن تازہ کیا!
دہر میں افسانۂ دار و رسن تازہ کیا

دھوم تھی پھر عیسیٰ معجز بیاں پیدا ہوا
حق کا آئینہ، حقیقی ترجماں پیدا ہوا

دین و ملّت کو بچایا دنیوی اشرار سے
زندگی میں روح پھونکی گرمئ گفتار سے

توڑ ڈالے سحرِ باطل فلسفی تلوار سے
نوعِ انساں کو رہائی دی بتِ پندار سے

مطلعِ انوار تھا، سارے زمانے کے لئے
حق نے بھیجا تھا اُسے باطل مٹانے کے لئے

عرش سے بھی دور جاتا اس کا شاہینِ قیاس
پاک اس کی روح تھی، اور اس کا دل فطرت شناس

دُرِ یکتا ایسے لاتی، اُس کی طبعِ ارتماس
جس سے بیگانہ زمیں والوں کے تھے فہم و حواس

دل نہ تھا پہلو میں رمزِ طور کا گنجینہ تھا!
باخبر تھا سرِ وحدت سے مگر آئینہ تھا!

آنکھ سب کچھ دیکھ لینی گو نشیمن دور تھا
صنعتِ صانع کا ہر ذرہ اسے اک طور تھا
ساغرِ ہستی مئے توحید سے معمور تھا
پی کے اک قطرہ بہک جاتا، نہ وہ منصور تھا

محرمِ اسرارِ حق تھا، زینتِ محفل بھی تھا!
بھولے بھٹکے کارواں کا رہبرِ منزل بھی تھا!

مشرق و مغرب پہ اس کے سوزِ دل کی دھاک تھی
اس کی فطرت بے غرض، بے لوث تھی، بے باک تھی
گردِ نیرنگِ جہاں سے طبع اس کی پاک تھی
دولتِ دنیا بھی نظروں میں خس و خاشاک تھی

شاعری اس کی کلام اللہ کی تفسیر تھی!
اس کی اک اک بات، قومی درد کی تصویر تھی!

آہ! اے مسلم، ترا آرامِ جاں جاتا رہا
خوں رو! اے ہند تیرا پاسباں جاتا رہا

"وائے ناکامی"! متاعِ کارواں جاتا رہا
نظمِ ہستی کا وہ سچا ترجماں جاتا رہا

ملّت آوارہ ہے، میرِ کارواں رخصت ہوا!

جب بہاریں آ رہی تھیں، باغباں رخصت ہوا!

اے عروجِ شاعری! اب تیری قسمت لُٹ گئی
جس نے بخشی تھی حیات نو، وہ دولت لُٹ گئی

فخر حاصل جس سے تھا تجھ کو وہ نعمت لُٹ گئی
شعریت کی وہ ترنّم ریز لذّت لُٹ گئی!

قلب کو مسحور کر لیتا مگر ساحر نہ تھا!

تھا امینِ رازِ قدرت، آہ وہ شاعر نہ تھا!

آہ! اب آئے گا کس کے نام پیغامِ حجاز؟
کون سمجھائے گا "اسرارِ خودی" کے سوز و ساز؟

اب "رموزِ بیخودی" کا کون ہوگا نغمہ ساز؟
"اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گُل کا راز؟"

رہروِ منزل پریشاں ہیں، فضا خاموش ہے!

کارواں لوٹا گیا، بانگِ درا خاموش ہے!

آج گو خاموش تیرا ہو چکا سازِ حیات
حشر تک زندہ رہے گی تیری آوازِ حیات

کر چکا جب ساری دنیا پر عیاں رازِ حیات
چاہتا تھا اور رفعت تیرا شہبازِ حیات

تھی ادھر مصروف تیری رُوح جب پرواز میں
ہو رہی تھیں عرش پر خوشیاں ترے اعزاز میں

کہکشاں کہتی تھی، دُرِّ آبدار آنے کو ہے
واپس اپنے پاس حق کا رازدار آنے کو ہے

تھا فرشتوں کی زباں پر تاجدار آنے کو ہے
ملتِ بیضا کا یعنی جاں نثار آنے کو ہے

پیرِ گردوں نے کہا، وہ آ رہا ہے سربلند!
جس کے شکوے تھے سدا شانِ کریمی کو پسند!

بولے سیارے زمیں کا حال کیا ہو جائے گا؟
دھوم ہے حق کا پیامی آج واپس آئے گا!

چاند کہتا تھا کہ دیکھو کچھ نہ کچھ رنگ لائے گا
اس کا جانا اہلِ دنیا پر قیامت ڈھائے گا!

بولا رضواں، مسلمِ صادق کا استقبال ہے!
بعد مدّت کے کھڑا ہوں آمدِ اقبال ہے!

آہ! اے اقبال تجھ کو بے خبر سمجھے نہیں
جو سمجھنا چاہیئے تھا اُس قدر سمجھے نہیں!

ہائے کیا بد بخت تھے جو بے بصر سمجھے نہیں　　　زعمِ باطل تھا کہ سمجھے ہیں مگر سمجھے نہیں

تو زمانے سے نرالا تھا، انوکھے طور تھے!

تیرے آئینے میں وہ رمزِ نہاں کچھ اور تھے!

یوں تو چلتے ہی رہیں گے کاروبارِ زندگی　　　گہ بجھیں گے، گاہ بھڑکینگے شرارِ زندگی

آئے گا دورِ خزاں بھی، اور بہارِ زندگی　　　گل کھلائے گا ہزار ہا لالہ زارِ زندگی

اور صد ہا ہوں گے پیدا فلسفی، شاعر، ادیب!

آہ یہ ممکن نہیں اقبال ہو گا پھر نصیب!

موت کی ساعت کوئی قوت ٹلا سکتی نہیں　　　اور تنِ مردہ میں واپس سانس آسکتی نہیں!

اپنی حد سے عمر اک لحظہ بڑھا سکتی نہیں　　　روح کو لیکن اجل ہرگز مٹا سکتی نہیں!

جس کی فرقت میں جہاں بے چین ہے بیتاب ہے!

دامنِ رحمت میں اُس کی روح محوِ خواب ہے!

۱۹۳۸ء

رحلتِ اقبال

فلسفی شاعر و عالم کی نہیں کچھ تخصیص
موت کے جور سے ہے کون جو پامال نہیں
آہ رونا تو یہ ہے قوم کا دم ساز گیا
ہند میں شاعروں کا ورنہ کوئی کال نہیں
ہائے توقیر گئی قوم کی اقبال کے ساتھ
عزتِ قوم ہے مردہ اگر اقبال نہیں!

۱۳۵۷ ہجری

سنہ ۱۹۳۸ء

اقبالؒ کی آرامگاہ

ملّت کی بے حسی سے، تنگ آ کے سو گیا ہے!
دُنیا کی شور شوں سے، اُکتا کے سو گیا ہے!
آہستہ چل صبا یاں، کیا تجھ کو ہو گیا ہے؟
پچھلے پہر کی کوئل! اے صبح کی موذن!
کیوں شور کر رہی ہے، بے چین ہے تو کس بن؟
آ دیکھ اس جگہ پر، وہ تیرا ہمنوا ہے!
اے چاند! تجھ کو جس نے "شاعر کا دل" کہا تھا
"قومی نشاں" کا تجھ کو منصب عطا کیا تھا
وہ میرِ کارواں اب، مرقد میں سو رہا ہے!

(۲)

ساکت ہے کیوں ہمالہ اب کس کا منتظر ہے؟
اُس رفعتِ بیاں پر اب کون مقتدر ہے؟
وہ نغمہ سنج تیرا خاموش ہو گیا ہے!
"اے آبِ رودِ گنگا، وہ دن ہیں یاد تجھ کو؟"
کیا کیا جتا رہا تھا، اک خوش نہاد تجھ کو!
فطرت کا وہ سندیسی، دُنیا سے جا چکا ہے!
اے شام کی دلہن کو مہندی لگانے والے!
اُس کو ذرا جگا دے، سب کو جگانے والے!
مورا ور چکور جاگے، اقبال سو رہا ہے!

(۳)

اقبال! قوم تیری، بیدار ہو رہی ہے
تو سو گیا تو اب وہ، ہشیار ہو رہی ہے

اُٹھ دیکھ، جوش تیرا ہر دل میں رونما ہے!
پھر ایک بار کہہ دے! "ہندوستاں ہمارا"
"ہندوستاں ہمارا! سارا جہاں ہمارا"
ہاں اُٹھ، تری صدا کو عالم ترس رہا ہے!
لاہور کی زمیں ہے اقبال مند کتنی
وابستگی سے تیری، ہے سربلند کتنی
اب کعبۂ عقیدت یہ شہر بن گیا ہے!
قلب و نظر کی دولت، اک آہِ صبح گاہی
فقرِ غیور سے ہے پیدا جلالِ شاہی
مردِ فقیر "شاہی مسجد" جگا رہا ہے!

۱۹۴۲

بہارِ آخریں

(ارمغانِ حجاز کو دیکھ کر)

نظر آنے لگے جلوے خداوندِ سخنداں کے!   سنبھل اے دیدۂ گریاں! کہ ہیں آثار طوفاں کے!

سنائی دے رہی ہیں پھر وہی مانوس آوازیں   کوئی سازِ غزل پر چھیڑتا ہے راگ عرفاں کے

مجھے محسوس ہوتا ہے وہ کب کا جا چکا یاں سے   یہ نغمے ہیں فقط اک گونج ملت کے حدی خواں کے

نہ آئے گا کوئی پیغامِ تازہ اب نہ آئے گا   بشیر اب بند کیا ہوں گے یہ آنسو چشمِ گریاں کے

"جگر کا خون دے دے کر جو بوٹے اُس نے پالے تھے"!
یہ اوراقِ پریشاں "ارمغاں" ہیں اُس گلستاں کے!

۱۹۳۹ء

سوز و ساز

تجلیاتِ معراج

خدائی نور سے معمور ہے، خدا مسرور
ہر ایک ذرہ عالم ہے رشکِ وادیٔ طور
یہ رات وہ ہے کہ جس میں کوئی دعا مانگے
فرشتے کہتے ہیں "آمین" کبریا "منظور"!

پُر نور فضائیں ہیں، رحمت کی گھٹا چھائی
مسلم کو مبارک ہو! معراج کی رات آئی
نورانی طبق لے کر حوران بہشتی، کی
بطحا کی طرف کیوں ہے یہ بادیہ پیمائی؟

یہ رات کہ ہے یکسر "لولاک لما" گویا
بے شبہ ہوئے جس میں، اسرارِ خدا پیدا
کیا شانِ ربوبیت ہے عینِ عرب الجھ میں
اس عین کے پردے سے ظاہر ہوا رب تیرا

پیدا ہوئے مکہ میں جب آخری پیغمبر
بُت گر گئے سجدے میں "اللہ احد" کہہ کر
وہ ماہِ عرب آیا، وہ فخرِ اُمم آیا
معراج عرب کی ہے، ظلمت میں عجم آیا

حیوان جو تھے اُن کو، انسان بنایا ہے
اللہ کے بندوں کو، اللہ سے ملایا ہے
ہر لحظہ درود اُس پر، ہر آن سلام اُس پر
اُترا ہے کلامِ حق، قرآنِ مبیں جس پر

ہر سال یوں ہی یارب، معراج کی رات آئے!
یعنی کہ رجب ہی میں، تعبیرِ برات آئے!!

۱۹۴۳ء

یومِ عاشورہ

ہے شاہِ شہیداں کی شہادت کا بیاں آج
عشرے کا ہے دن ہوتا ہے تاریک جہاں آج

ہے ساقئ کوثر کا پسر تشنہ دہاں آج
میدانِ بلا میں ہے قیامت کا سماں آج

کیا آئی گلستانِ رسالت پہ خزاں آج
ہے قاسمؑ گلپوش نہ اکبرؓ سا جواں آج

شہ تین شب و روز سے بے آب و غذا ہیں
فرزندِ ید اللہ کی سوکھی ہے زباں آج

دفنا کے شہیدوں کو کہا سبطِ نبیؐ نے
ہے آلِ پیمبر کا چمن نذرِ خزاں آج

میدان میں گُل ہونے کو ہے شمعِ امامت

ہو جائے گا تا عصر یہ تاریک جہاں آج

عریاں سرِ زینبؓ ہے لئے چادرِ تطہیر

جنت سے چلی آتی ہیں حورانِ جناں آج

شبیرؑ ہوئے قتل، ہوئیں بیبیاں بے بس

ماتم کدہ ہے احمدِ مرسل کا مکاں آج

حکمِ شہِ دیں حُر نے یہ رضواں کو سنایا

تا عصر کھُلا رکھے درِ باغِ جناں آج

نوحے سے ترے کیوں نہ بشیرؔ آئیگا رونا!
مصروفِ فغاں رہتا ہے جب کون و مکاں آج!

سنہ ۱۹۲۷ء

قیامتِ صغریٰ

اکبر بچا، رہا نہ برادر حسینؓ کا
اُجڑا ہے دوپہر میں بھرا گھر حسینؓ کا

انصاف کیجیے حضرتِ ایوبؑ آپ ہی
صبر و رضا میں کون ہے ہمسر حسینؓ کا

کل تک تھی گودِ فاطمہؓ زہرا کی خوابگاہ
ہے آج گرم ریت پہ بستر حسینؓ کا

بعدِ شہادتِ شہِ مظلوم آہ آہ
لوٹا ہے کوفیوں نے بھرا گھر حسینؓ کا

تھی مصلحت خدا کی وگرنہ تھی کیا مجال
کرتا مقابلہ کوئی لشکر، حسینؓ کا

انصاف کیا یہی تھا فلک تیرے دور میں؟
سمجھا نہ تو کہ جد ہے پیمبرؐ حسینؓ کا

سیراب وحش و طیر ہوں آبِ فرات سے
اور تشنگی سے حال ہو ابتر حسینؓ کا

پیشِ رسولؐ مرحلۂ تیغ و حلق تھا
حلقوم چومتے تھے جو اکثر حسینؓ کا

بیعت کے واسطے نہ دیا ہاتھ، سر دیا
احسان دین پر ہے سراسر حسینؓ کا

یہ غم وہ ہے جس میں خوشی دو جہاں کی ہے
اے دل، مدام ذکر کیا کر حسینؓ کا!

۱۹۳۱ء

معراجِ غم

تمام فوجِ عدو ہے حیراں، امامِ دیں مسکرا رہے ہیں
کہ لالِ زینب کے ننھے ننھے بپھر کے میداں میں آ رہے ہیں

یہ غم کے بادل ہیں چرخِ دل پر اُمنڈ اُمنڈ کر جو آ رہے ہیں
برس برس کر یہ اپنے دل کی سیاہیوں کو مٹا رہے ہیں

تمام حُوریں سنور رہی ہیں، ملائکہ بندوبست میں ہیں
کہ اہلِ بیتِ رسولِ اکرمؐ شہید ہو ہو کے آ رہے ہیں

نکل کے خیمہ سے وقتِ رخصت، امامِ والا یہ کہہ رہے ہیں
ملول کیوں ہو رہی ہو بانو، رسولؐ ہم کو بلا رہے ہیں

یہ دینِ اسلام وہ ہے جس کو کبھی نہ دشمن مٹا سکیں گے
یہ اور مضبوط ہو رہا ہے، وہ جس قدر بھی مٹا رہے ہیں

بشیر دونوں جہاں کی خوشیاں حسینؓ انکو عطا کرینگے
غمِ شہادت میں جتنے شاعر، سلام اپنے سُنا رہے ہیں!

۱۹۳۲ء

سانحاتِ کربلا

آہ! کیا حسرت فزا ہیں سانحاتِ کربلا
کس قدر صبر آزما ہیں واقعاتِ کربلا!

اے شہیدِ کربلا! اے جانِ بنتِ مصطفیٰ!
اے امامِ تشنہ لب! اے نورِ چشمِ مرتضیٰ!

مدتیں گزریں مگر تازہ ترا افسانہ ہے
جو کبھی خالی نہیں ہوتا یہ وہ پیمانہ ہے

دل تری اُمت کا تیرے درد سے خالی نہیں
رہتی دنیا تک وہ تجھکو بھولنے والی نہیں

آج تازہ تیرے سوزِ غم سے داغِ سینہ ہے
پھر چھلکتی ساغرِ نو میں مئے دیرینہ ہے

آہ مظلومی پہ تیرے اشکِ خوں روتے ہیں ہم!
تو سراپا صبر تھا، اور صبر کو کھوتے ہیں ہم!

جس کے جھولے کو جُھلاتے تھے کبھی روح الامیں

اپنے سینے پر سُلاتے تھے جسے سردارِ دیں

مسکرا دیتا اگر آغوشِ زہرؓا میں کبھی

حوریں آتی تھیں بلائیں لینے کو فردوس کی

جو ہوا تھا فاطمہؓ کے شِیر سے پل کر جواں

دست و بازو سے تھی جس کے حیدریؓ سطوت عیاں

جس کی نسبت یہ سُنا ہے فخرِ موجودات سے

روشنی ہے فاطمہؓ کے گھر میں اس کی ذات سے

جس کا دروازہ کھُلا رہتا غریبوں کے لئے

وقف جس کا مال و زر رہتا یتیموں کے لئے

کیا خبر تھی جان پر اُس کے یہ آفت آئے گی!
ظلم پر آمادہ اپنی قوم ہی ہو جائے گی!

آہ تجھ کو ظالموں نے بے سبب دھوکا دیا
نامے لکھ لکھ کر بلایا اور غلط وعدہ کیا

کون ہے ہمسر ترا اے مصدرِ صبر و رضا
گھر لُٹا کنبہ لُٹا تو نے نہ شکوہ کچھ کیا

حلق پر لختِ جگر کے تیر چلتا دیکھ کر
کلمۂ حق تھا زباں پر آسماں پر تھی نظر

قلب گو مضطر ہے، سبطِ احمدِ مختار کا
اذن ہوتا ہے مگر فرزند کو پیکار کا

ریت کا وہ گرم میداں اور وہ نازک قدم
جن کے چلنے کیلئے مخصوص تھا صحنِ حرم

دوپہر کی دھوپ اور پھر وہ تمازت الاماں

اور اس پر پیاس کی شدت کہ سوکھی تھی زباں

بچہ بچہ کافروں کا شاد تھا سیراب تھا

فاطمہؓ کا لال پانی کے لئے بیتاب تھا

تھا صف آرا چار سو لشکر اُدھر کفّار کا!

اور اِدھر تنہا پسر تھا حیدرِؓ کرّار کا!

شاہ نے تلوار کھینچی تو قیامت آگئی

تیغ کھنچتے ہی جُلو میں فتح و نصرت آگئی

ہو رہے تھے تیغ حضرت سے ہزاروں سر قلم

سامنے آنے کو تھرّاتے تھے اعدا کے قدم

برق آسا جب چمکتی تھی وہ سیفِ آبدار

سینکڑوں زخمی ہزاروں ختم ہوتے نابکار

مچ گئی لشکر میں اُودھم، چھپتے پھرتے تھے لعیں
مسکرا دیتے تھے ان کے بھاگنے پر شاہِ دیں

درمیانِ جنگ دیکھا جبکہ ہے وقتِ نماز
پھینک کر شمشیر قبلہ رُو ہوا ماہِ حجاز!

محوِ طاعت دیکھ کر کفّار چلّانے لگے
پا کے موقع ہر طرف سے تیر برسانے لگے

خون آلودہ زمیں پر جھک گیا سجدے میں سر
شمر نے تلوار رکھ دی گردنِ شبیرؑ پر

اِک اندھیرا چھا گیا تھرّا گیا عرشِ بریں!
جب ہوا سبطِ پیمبرؐ کی شہادت کا یقیں!

الوداع اے تاجدارِ دین و ملّت الوداع
اے گُلِ صد رنگِ گلزارِ رسالت الوداع

دے کے سر تو نے بچائی آبروُ ایمان کی

ملّتِ بیضا پہ اپنی جان تک قربان کی

موت ہو یا زندگی ہو سب یدِ قدرت میں ہے

ناشکیبائی مگر انسان کی فطرت میں ہے

چشمِ تر جس کی نہ ہو اسلام سے بیگانہ ہے

جو ترے غم سے ہو خالی، دل نہیں ویرانہ ہے

یہ نہیں وہ غم کہ اک ہنگامۂ بے ہوش ہو

لب پہ تیرا نام ہو، اور زندگی خاموش ہو!

عہدِ ماضی پر نظر کر اے مسلماں غور سے

جان دی ہے حامیانِ دیں نے کس کس طور سے!

درس جانبازی کا ہے یہ مسلمِ خوابیدہ کو

کارناموں کو سلف کے دیکھ اور بیدار ہو!

"تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را !
گاہے گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را" !

سنہ ۱۹۳۱ء

شاہِ ولایتؓ

(حضرت غوث اعظم محبوب سبحانی رضی اللہ عنہٗ)

مرعوب مہر و ماہ، جلالِ مقام سے!
لرزاں فلک ہے شاہِ ولایتؓ کے نام سے!
جن کی حیاتِ پاک طریقت کی جان ہے
جن کا طریق و طور شریعت کی شان ہے!
جن کی حمایتوں نے ابھارا ہے دین کو
جن کی تجلیوں نے سنوارا ہے دین کو!

غوث الورائی کا سرِ اقدس پہ تاج ہے
مجبوبیت کا ساری خدائی میں راج ہے!

فیض و تصرّفات کی حد ہے نہ ہے حساب
ذرّے کو آپ چاہیں تو بن جائے آفتاب!

مطلوبِ حق ہیں آپ خدائی ہے آپ کی!
عقدہ کُشائے خلق! دُہائی ہے آپ کی!

سنہ ۱۹۴۲ء

سلطان الہند

زہے قسمت! درِ خواجہ تک اب اپنی رسائی ہے
سنبھلنے دے مجھے اے دل کہ وقتِ جبہہ سائی ہے!

کنارِ عافیت گُم ہے! یہاں اشکِ ندامت سے
وہاں بارانِ بخشش سے گھٹا رحمت کی چھائی ہے

خوشا طالع، سیہ روزی کے اپنے آج دن پلٹے
کہ آہوں میں اثر ہے، اور نالوں میں رسائی ہے

مرے خواجہ، مرے آقا! دعا مقبول ہو میری
تمنا کامیابی کی دکن سے کھینچ لائی ہے!

ترے اس عتبۂ عالی سے خالی ہاتھ کیا جاؤں
زمینِ ہند کا یہ قبلۂ حاجت روائی ہے

درِ اقدس پہ شنوائی نہ ہوگی کس طرح میری؟
مراد ہر ایک سائل نے جو مانگی ہے سو پائی ہے!

بچالے ہم کو آفت سے، بتادے راستہ سیدھا
کہ ہم نے عمر یا خواجہ گناہوں میں گنوائی ہے

ترے دربار میں آنا، دلِ آگاہ پانا ہے
ترا پابند ہو جانا، ہمیشہ کی رہائی ہے

ترے ہم در پہ کیا آئے، ہوئیں سب مشکلیں آساں
مشرّف ہیں زیارت سے، مرادِ دل یہ پائی ہے

ترے در سے کوئی مایوس ہو کر کس طرح لوٹے
یہاں ہر عقدۂ مشکل کی، جب مشکل کشائی ہے!

فضا اجمیر کی معمور ہے خواجہ کی بخشش سے
کہ ہُنتیروں نے بن مانگے یہاں دولت کمائی ہے
بشیرِ دل حزیں پر ہو کرم اجمیر کے باشی!
غم و آلام نے گھیرا مرے مولا دہائی ہے!

۱۹۳۱ء

شانِ خسروؒ

اے عندلیبِ خوشنوا، پروانۂ نظام دیںؒ!
روحانیت نواز ہے، تیرا کلامِ دل نشیں!
سلسلۂ نظامیہ، ہے داستانِ خسروی!

مردِ حقیقت آشنا، تھا آستاں پہ بدگماں
اور وارداتِ قلب تھے، شیخِ طریق پر عیاں
کس درجہ ناز آفریں، تھا امتحانِ خسروی!

دل ایک ہی نگاہ میں، محرمِ راز بن گیا
اور اک کبوترِ حزیں، دم بھر میں باز بن گیا
عشق کی ایک جست میں، بدلا جہانِ خسروی!

درویشِ بے مثال تو، شاعرِ بے نظیر تو
نازشِ خانقاہ تو، نورِ نگاہِ پیر تو
فقر کی آن بان پر، قائم ہے شانِ خسروی!

ہند و تتار و پارس کو، شیر و شکر بنا دیا
سب کی زباں سے تو نے اک، جادو نیا جگا دیا
اُردو زباں کی جان ہے، اب تک زبانِ خسروی!

فرما رہا ہے پیر ہی، شان میں یہ مرید کی
"من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی"!
محبوبِ حق کی جان تھی، لاریب جانِ خسروی!

۱۹۴۳ء